خواب زخمی ہیں
ثروت زیدی

کہانی یا ناول لکھنے کا مقصد یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ قارئین کے لئے اخلاقیات کا ایک ضابطہ یا ہدایات کا کوئی نسخہ پیش کردیا جائے۔ فکشن کا ایک بڑا مقصد دوسروں کو اپنے خیالات و نظریات میں حصہ دار بننے کی محض دعوت دینا ہوتا ہے کہ وہ اسے پڑھیں اور چاہیں تو اتفاق کریں ورنہ وہ لکھنے والے سے شدید اختلاف بھی کریں گے تو اُن کے اس حق کی قدر کی جائے گی۔ مطلب یہ کہ لکھنے والا اپنے پڑھنے والوں کو غور و فکر کرنے پر ضرور مجبور کرے اور اُس کی تحریر ان کے سروں پر سے نہ گزر جائے۔

ثروت ذکی نے اپنے پہلے ہی ناول میں ایک ایسے سماجی مسئلہ پر قلم اُٹھایا ہے جو ہندوستان کے قریب قریب ہر فرقے کو خاصی پریشانی میں مبتلا کئے ہوئے ہے۔ عورت اس مسئلہ کے یوں بھی بہت قریب ہے کہ اس نے اسی کی ذات سے جنم لیا ہے اور وہی اس مسئلے کو ختم کرنے کے لئے کوئی انقلابی قدم اُٹھا سکتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں ہندوستان سے باہر جن قوموں نے اس لعنت کو اپنے قریب نہیں پھٹکنے دیا اُن سے بھی اس مسئلہ کا نفسیاتی تجزیہ کرنے میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔

رام لعل

خواب زخمی ہیں

خواب زخمی ہیں

(ایک ناول)

ثروت ذکی

سیمانت پرکاشن
۹۲۲، کوچہ روہیلا، تراہا بہرام
دریا گنج، نئی دہلی ۲-۱۱۰۰۰

قیمت : پچیس روپے ۲۵/-
بارِ اوّل : ۱۹۸۳ء
کتابت : محمد اکرام کٹھاری
مطبع : وجیتا آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی-۲

ناشر :
سیمانت پرکاشن
۹۲۲، کوچہ روہیلا، تراہا بہرام
دریا گنج، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲

KHAWAB ZAKHMI HAIN: NOVEL
SARWAT ZAKI PRICE Rs.25.00

اِندراجی
کے
نام

اپنی بات
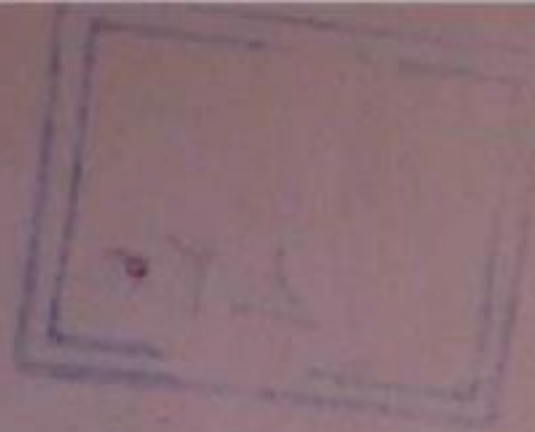
بھائی نریندر ناتھ سوز صاحب کا اصرار ہے کہ میں اپنے بارے میں کچھ تھوڑا بہت لکھوں۔ کچھ بھی لکھوں لیکن لکھوں ضرور۔ حالانکہ اس کی کوئی خاص ضرورت نہ تھی ــــــــ بس مجھے اب کہنا یہی ہے کہ یہ ناول میری ایک چھوٹی سی پہلی کوشش ہے بلکہ چند پیغامات ہیں جو میں آپ لوگوں تک پہنچانا چاہتی ہوں اور جس چیز نے مجھے ہمیشہ بہت متاثر کیا ہے وہ ہے جہیز جیسی لعنت کی اذیت ناکی اور میں سمجھتی ہوں کہ اس سے بڑی بُرائی ہمارے سماج میں اور کوئی ہے ہی نہیں۔ اِسی ناسُور کی وجہ سے آئے دن کئی لڑکیاں موت کے مُنہ میں دھکیل دی جاتی ہیں۔ کچھ بہانہ بنا کر جلا دی جاتی ہیں۔ میرے ناول کی ہیروئن موہنی بھی اسی اذیت کا شکار ہوئی ہے۔ اب اس کا فیصلہ میرے قارئین ہی کریں گے کہ میں اپنی اس اوّلیں کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوئی ہوں۔

اَب مَیں اپنے محترم بزرگ اور مہربان ہستی کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں جنھوں نے میری بہت حوصلہ افزائی کی ہے، وہ ہیں ملک کے نامور اور مایۂ ناز ادیب جناب رام لعل، جن کی مَیں شرُوع سے مدّاح بھی رہی ہوں اور دوسرا شکریہ تو اپنے بھائی سوز صاحب کے لیے ہے ہی ـ جنھوں نے اس ناول کی اشاعت میں میرا بھرپور ساتھ دیا۔

میرا آبائی وطن نہٹور ہے جو ضلع بجنور کا ایک خاصہ بڑا قصبہ ہے۔ والد ماجد سیّد اقبال حُسین زیدی مرحوم جو علی گڑھ یونیورسٹی کے گریجویٹ تھے۔ گو پولیس میں انسپکٹر رہے اور مستعفی ہو کر پھر سیاست میں بھی آئے لیکن اس کے باوجود اچھا ادبی ذوق رکھتے تھے اور جو کچھ بھی آج مَیں ہوں انھیں کے بے پناہ پیار اور تربیت کی بدولت ہوں۔ طبیعت بے انتہا حساس پائی ہے۔ غم کہیں بھی ہو کسی کا بھی ہو میرے ذہن کو ضرور بوجھل کر جاتا ہے۔ ہمہ وقت ایک عجیب سی بے چینی اور انتشار چھایا رہتا ہے۔ جن کی وجہ بعض اوقات کچھ بھی نہیں ہوتی۔ شاعری کا بھی شوق رہا ہے۔ چند غزلوں اور تھوڑی

سی آزاد نظموں کا ایک مختصر سا سرمایہ بھی ہے میرے پاس - ایک دو غزلیں ماہنامہ "بیسویں صدی" اور "شمع" میں بھی چھپ چکی ہیں - شوہر محترم مقامی کالج میں پرنسپل ہیں - قابلیت کا بڑا شہرہ ہے آس پاس - خاص طور پر انگریزی میں تو اُن کا ہم پلہ دُور دُور بھی نہیں - لیکن ان کی راہیں جُدا ہیں - ذہن ان کا بھی سوچتا ہے اور بہت سوچتا ہے لیکن صرف کام کی بات - سخت PRACTICAL قسم کے انسان ہیں - اور بس ——— !

——— ثروت ذکی

آج بہنیں اپنے بھائیوں کے راکھی باندھ رہی ہیں۔ نئے نئے خوبصورت کپڑوں اور ہری پیلی لال ساڑیوں میں قوسِ قزح کے رنگ بکھیرتی، لہراتی، بل کھاتی خوشی کے پروں پر اُڑتی ہوئی چھوٹی بڑی امیر غریب، ہر عمر اور ہر طبقہ کی بہنیں۔ دِل میں خوبصورت جذبوں اور امنگوں کی ایک دنیا لئے ہوئے۔ فضاؤں میں رنگ ہی رنگ ہیں، خوشبو ہی خوشبو ہے۔ کیف و مستی کا ایک سیلاب ہے۔ جو چاروں طرف سے اُمنڈا ہی چلا آتا ہے۔ یہ کیف اور رنگینی کا احساس اور دِل کے یہ خوبصورت جذبے ہی تو ہیں جو انسان کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ اگر یہ جذبے اور یہ امنگیں نہ ہوں تو آدمی راکھ کا ایک ڈھیر ہو کر رہ جائے۔ ہر گھر میں ریڈیو۔ ٹرانزسٹر اور ٹی۔ وی پر راکھی بندھن کے نئے نئے پروگرام۔ ڈرامے اور پیارے گیت اُبھر رہے ہیں جو سیدھے دِل میں اُترتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں جنکو سُن کر اچھے بھلے دِل بھی بھر آتے ہیں۔ آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔ ایک بڑا ہی انوکھا میٹھا میٹھا درد بھرا احساس، ایک عجیب ٹھنڈی ٹھنڈی سی تڑپ جاگ اُٹھتی ہے ان گیتوں کو سُن کر۔ کتنے عجیب ہیں ریشم کے یہ رنگین دھاگے اور اِن کا مقدس بندھن چند کمزور سے دھاگے جو لوہے اور فولاد کی موٹی موٹی زنجیروں سے بھی زیادہ مضبوط ہوتے ہیں اور کبھی کبھی تو یہ معمولی کچے دھاگے کسی اجنبی کو بھی بھائی کے پُر خلوص رشتے میں ہمیشہ کے لئے جکڑ لیتے ہیں اور یہ بندھن تو اور بھی خوبصورت اور دِل کو چھو لینے

والے ہوتے ہیں جنکو دیکھ کر اکثر دِل خوشی سے اُچھلنے لگتا ہے اور آنکھیں بے ساختہ چھلک جاتی ہیں۔

بہن جو ہمیشہ سے کمزور اور پیار کی بھوکی ہے راکھی ہاتھ میں لیکر بڑھتی ہے بھائی کی طرف نئی نئی اُمیدیں من میں بسائے کہ میرا بھائی ہمیشہ میری رکشا کرے گا میرے اُوپر کبھی کوئی مشکل آئی تو بچانے کے لئے بھاگا چلا آئے گا اور بھائی بھی دِل میں ایک عجیب طرح کا پیار بھرا احساس اور آنکھوں میں محبّت اور خوشی کا ایک انوکھا سا نشہ لئے ہوئے ہاتھ آگے بڑھاتا ہے لیکن جن بہنوں کا کوئی بھائی نہو اور اگر ہو بھی تو راکھی بندھن سے پہلے ہی چھوڑ کر اُنہیں ایسی جگہ چلا گیا ہو جہاں سے کوئی لوٹ کر ہی نہیں آتا اُن بہنوں پر اُس دِن کیا کچھ نہ گذر جاتا ہوگا۔

موہنی اور لکشمی دو ایسی ہی بد نصیب بہنیں ہیں جن کا شیر جیسا بھائی دو مہینے پہلے دفتر سے واپس آتے ہوئے ایک تیز رفتار ٹرک سے ٹکرا کر آدھے گھنٹے کے اندر ہی موت کی خاموش وادیوں میں کھو گیا بغیر یہ سوچے ہوئے کہ اِس وقت بوڑھے کمزور باپ اور دو بے سہارا بہنوں کو اس کی کتنی شدید ضرورت ہے خصوصاً انتہائی خستہ حال بیمار اور زندگی سے بیزار موہنی کو جسے ڈاکٹروں نے خوش رکھنے کی ہدائت کر رکھی ہے۔

کون جانے اُن کے بھائی ستیش کے دماغ میں اُس وقت کتنے طوفان اُٹھ رہے ہوں گے کتنی ہلچل مچی ہوگی کہ وہ اتنا کھو گیا کہ اُس کو ٹرک سے بچنے کی سُدھ بھی نہیں رہی صرف چھ مہینے ہی تو رہ گئے ہیں اُس کی دوسری بہن لکشمی کی شادی میں۔ چار دن پہلے اس کی سگائی کے دِن وہ بظاہر تو بڑے اطمنان سے اِدھر اُدھر دوڑتا بھاگتا رہا لیکن اندر کی بے چینی اُسکی آنکھوں سے برابر چھلکتی رہی لڑکے کے باپ کے چہرے کی سختی دیکھ کر اُس کو اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوتا لیکن لڑکا اچھا تھا پڑھا لکھا سمجھدار اور ہنس مکھ اس لئے اُس کو چھوڑتے نہیں بنا اور اب اُس کو ہر دم یہی فکر کھائے جاتی تھی کہ اپنی دن رات کی محنت

سے وہ اتنا کر بھی پائے گا کہ اُس کے ہونے والے سسر کی جہیز کے علاوہ پندرہ ہزار نقد روپیہ کی مانگ کو پورا کر سکے اور اگر یہ سب وقت پر نہ ہو پایا تو پھر موہنی کی طرح لکشمی کو بھی تمام عمر روتے سسکتے اور بے اندازہ غم کا زہر پیتے ہوئے گذارنی ہوگی۔

موہنی جو اپنے بھائی کو سامنے دیکھ کر اپنا غم بھول جاتی تھی آج راکھی کے دِن سب سے زیادہ مضطرب ہے۔ صبح سے ایک پل کو بھی بھائی کی تصویر اُس کی نظر سے نہیں ہٹی لیکن صبر اور ضبط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹا ہے آنکھوں میں آنسو بھی نظر نہیں آ رہے ہیں بس ویرانی نے ڈیرہ ڈال دیا ہے ساری دنیا کا کرب اور ویرانی جیسے ان آنکھوں میں ہی سمٹ آئی ہے۔ اُس کی دنیا میں تو بالکل ہی اندھیرا چھا گیا۔ اتنا گمبھیر اور ڈراونا اندھیرا کہ اُجالے کی ایک ننھی سی کمزور کرن بھی نہیں۔ اور یہی حال اُن کے باپ منشی دینا ناتھ جی کا ہے۔ جوان بیٹے کا صدمہ یوں بھی کچھ کم نہیں ہوتا اور پھر بیٹا بھی کیسا۔ بہت کم لوگوں کو ایسی نیک اور سعادت مند اولاد خدا دیتا ہے۔ اُن کی تو کمر ہی ٹوٹ گئی بغیر کمر کو ہاتھ لگائے تو اُن سے اُٹھا بھی نہیں جاتا۔ آنکھوں میں روشنی بھی بہت کم ہو گئی ہے۔ اِدھر اُدھر بیٹھ کر غم کچھ غلط کر بھی لیتے ہیں لیکن جب گھر میں آتے ہیں اور موہنی پر نظر پڑتی ہے تو چہرہ بدل جاتا ہے۔ بدن میں لرزش پیدا ہو جاتی ہے۔ لگتا ہے کھڑے نہ رہ سکیں گے۔ تھوڑی دیر ایسی حالت میں کھڑے رہنے کے بعد ہونٹوں کو بھینچے ہوئے آہستہ سے پھر کہیں باہر چلے جاتے ہیں۔

ابھی ابھی پھر وہ گھر میں داخل ہوئے ہیں اور ڈگمگاتے قدموں سے برآمدے میں جاکر چاروں طرف نظر دوڑائی ہے جیسے لڑکیوں میں سے کسی کو تلاش کر رہے ہوں۔ لکشمی اُن کو اس طرح کھڑا دیکھ کر لپکی۔

"کیا ہے بابو جی؟" ہاتھ دھو لیجئے میں کھانا لاتی ہوں۔"

"کھانا؟" بڑی مدھم سی آواز میں انھوں نے کہا جیسے بولے نہیں کہہ رہے ہوں۔ "مجھے بھوک نہیں ہے بیٹی تم لوگ کھا لو۔"

"نہیں بابو جی! تھوڑا سا تو کھا ہی لیجئے۔" لکشمی نے اصرار کیا۔

"اچھا تو پھر لے آؤ" وہ سامنے ہی نل پر ہاتھ دھونے چلے گئے وہ ہاتھ دھو ہی رہے تھے کہ کسی بچے کے تیزی سے بھاگ کر آنے کی آواز پر اُنہوں نے گردن موڑ کر اُدھر دیکھا۔ یہ پڑوس کی چھوٹی سی بچی بلّو تھی جو ہاتھ میں ایک خوبصورت سی راکھی لئے ہوئے دیدی دیدی پکارتی ہوئی موہنی کی طرف بھاگتی ہی چلی گئی جو سامنے والے کمرہ میں پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی۔

"دیدی دیکھو کتنی سُندر راکھی ہے" اندر سے بلّو کی تیز اور چہکتی ہوئی آواز آئی۔ "میں خود لائی ہوں جا کر یہ تمہیں کیسی لگی دیدی۔ اچھی ہے نا؟ تم بھی مجھ سے منگوا لینا بہت چھانٹ کر لادوں گی مگر۔ مگر تم کیا کروگی ہائے مجھے یاد ہی نہیں رہا تم کس کے باندھوگی راکھی ستیش بھیا تو بیچارے بھگوان کے یہاں چلے گئے" بلّو سب کچھ ایک سانس میں کہہ گئی۔

"بلّو۔ بلّو!" کھانا نکالتے نکالتے لکشمی نے کئی بار زور سے بلّو کو پکارا اور جب تک وہ سب کچھ کھُلا ہوا چھوڑ چھاڑ کر تیزی سے وہاں پہونچی تو بلّو اپنی بات پوری کر چکی تھی۔ اُس نے جھپٹ کر اُسے پکڑا اور باہر صحن میں لاکر بولی۔

"ایسا نہیں کہتے بلّو دیدی کی طبیعت پہلے ہی خراب ہے۔" اور اُس کو وہیں چھوڑ کر وہ پلٹی بہن کی طرف اور گھبرا کر اُسے آوازیں دینے لگی موہنی کا پورا جسم پسینے میں ڈوب رہا تھا آنکھیں بند تھیں اور سانس آہستہ آہستہ جھٹکے لے لے کر چل رہا تھا۔ لکشمی کی آواز کے جواب میں اُس نے دو ایک بار صرف ہوں کہا لیکن آنکھیں نہیں کھولیں اور جتنی دیر میں لکشمی اُس کی دوا لیکر آئی وہ بے ہوش ہو چکی تھی منشی جی بھی پریشان چہرہ لئے ہوئے آکر بیٹھ گئے اور پانی چلو میں لے کر اُسکے منہ پر چھینٹے مارنے لگے اور ایک دوا میں پھایا بھگو کر اُس کی ناک کے پاس لگایا کچھ دیر بعد اُس نے آنکھیں تو کھول دیں لیکن کمزوری اُس کو اس قدر تھی کہ کوشش کے باوجود وہ بول نہیں سکی۔ منشی جی لکشمی کو وہیں چھوڑ کر ڈاکٹر کو بلانے چلے گئے۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد ڈاکٹر آئے ایک انجکشن لگایا اور کوئی دوا کھلا کر یہ کہتے ہوئے اُٹھ

کھڑے ہوئے۔

"شام کے چار بجے تک اِن کو اسی طرح تنہائی میں لیٹا رہنے دیا جائے۔ کوئی شور وغل یا بات چیت اِن کے آس پاس بالکل نہیں ہونی چاہئے" اور دروازے کے پاس آتے آتے ذرا مدھم آواز میں اُنھوں نے کہا۔

"جہاں تک ہو سکے اِن کو خوش رکھنے کی کوشش کیجئے۔ ایسی کوئی بات اِن کے سامنے نہیں ہونی چاہئے جس سے اِن کو تھوڑا سا بھی دُکھ پہنچے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب لیکن جب دُکھ اتنے گمبھیر ہوں تو اُن کو اتنی جلدی کیسے گھٹایا یا مٹایا جا سکتا ہے۔ آج راکھی بندھن ہے۔ بھائی کا دھیان۔"

وہ سب میں جانتا ہوں منشی صاحب" ڈاکٹر بیچ میں ہی بول اُٹھے۔ پہلے ماں پھر بھائی اور پھر اپنے گھر کا چھوٹ جانا۔ شادی کے بعد کچھ دن یا کچھ مہینے تو عورت میکے میں خوشی خوشی رہ لیتی ہے لیکن اپنا گھر چھوڑ کر مستقل طور پر میکے میں رہنے کا تصور بھی عورت کے لئے جان لیوا ثابت ہوتا ہے۔ ویسے یہ ہے کہ وقت بہت بڑا مرہم ہے۔ ماں اور بھائی کا خیال تو دھیرے دھیرے کم ہو ہی جائے گا۔ لیکن جیون ساتھی کے روپ میں اگر ان کو کسی کا پیار یا دلجوئی مل جائے تو سنبھل سکتی ہیں ابھی ایسی خطرہ والی کوئی بات نہیں ہے" ڈاکٹر نے رُک رُک کر جھجکتے ہوئے اپنی بات پوری کی اور منشی صاحب کی طرف دیکھنے لگے۔

"نہیں نہیں ڈاکٹر صاحب ایسا کہاں ہو سکتا ہے کس طرح ہو سکتا ہے" منشی جی کو جیسے جھٹکا سا لگا۔ "ناممکن بالکل ناممکن ہے یہ بات۔ آپ تو آسمان سے تارے توڑنے والی بات کر رہے ہیں ڈاکٹر صاحب" وہ سر کو پکڑ کر وہیں باہر پڑے ہوئے مونڈھے پر بیٹھ گئے۔ ڈاکٹر نے افسوس بھری نظروں سے اُن کی طرف دیکھا اور دوسرا مونڈھا کھینچ کر اُن کے قریب بیٹھتے ہوئے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔

"حوصلہ رکھئے منشی صاحب سب کچھ ممکن ہو سکتا ہے اچھے آدمیوں ابھی دنیا میں اتنی کمی نہیں ہے۔ اچھا ایک بات بتائیے۔"

"جی!" منشی جی نے سر اٹھایا۔

"اب ان کو وہاں بھیجنا تو نہیں ہے نا؟"

"جی نہیں اب تو کوئی تُک ہی نہیں ہے وہاں واپس بھیجنے کی۔"

"اچھا تو پھر میں دیکھوں۔ میرے ایک دوست ہیں ڈاکٹر بھارگو اُنہوں نے میرے ساتھ ہی پڑھا ہے۔ بہت ہی بھلے آدمی ہیں بس یہ سمجھئے کہ اُن جیسے آدمی اس زمانے میں بہت مشکل سے ملیں گے اُن کی بیوی کا ابھی آٹھ نو مہینے ہوئے انتقال ہو گیا ہے۔ ڈھائی تین سال کی ایک بچّی چھوڑی ہے اور وہ ہر وقت ماں کو یاد کر کے روتی ہے اس لئے مجبوراً اپنی ساس کو اپنے پاس رکھ چھوڑا ہے تاکہ اُن کی موجودگی میں بچّی ماں کو کسی حد تک بھولی رہے۔ دیکھئے کبھی وقت نکال کر اُنکے پاس جاؤں گا۔" کچھ خاموش رہنے کے بعد آہستہ سے اُنہوں نے کہا۔ اور... اور اِس معاملے میں اُن سے بات کروں گا۔ وہ میری بات کبھی نہیں ٹالیں گے مجھے اُمید ہے۔

"لیکن ڈاکٹر صاحب یہ تو سوچئے کہ......"

"ارے وہ کچھ نہیں۔ میں سمجھ گیا آپ کی بات۔" ڈاکٹر اُن کی بات کاٹ کر بولے۔

"ایسی کوئی بات وہاں نہیں ہے۔ اِن خرافات سے بہت دور ہیں وہ لوگ گھر اُن کا بہت بڑا تو نہیں ہے لیکن سب پڑھے لکھے سمجھدار نئی روشنی اور نئے خیالات کے انتہائی نیک دِل اور شریف انسان ہیں۔ ماں باپ تو اب رہے نہیں دو بہنیں ہیں جنکی شادیاں ہو چکی ہیں اور خوش ہیں اپنے اپنے گھر۔" اچھا تو اب میں چلوں منشی صاحب ڈاکٹر سعید نے اپنا بیگ اُٹھاتے ہوئے کہا۔

"بہت بہت شکریہ ڈاکٹر صاحب۔" منشی جی بھی بڑے جوش سے اُٹھ

کھڑے ہوئے اور محبت سے اُن کو گلے لگاتے ہوئے بولے۔

"آپ کی باتوں سے میرے دماغ کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ اس وقت آپ انسان نہیں دیوتا ہیں ڈاکٹر صاحب۔ بھگوان آپ کا بھلا کرے مذہب کے نام پر ہم لڑتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ انسان ہونا کسی بھی مذہب کی جاگیر نہیں بھلا آدمی بھلا ہی ہوتا ہے چاہے کسی بھی دھرم کو مانتا ہو آج سے پہلے کسی نے اس طرح مجھے ڈھارس نہیں بندھائی اگر سنسار میں سب آپ جیسے ہی ہو جائیں تو برائی کا نام ہی نہ رہے۔" منشی دینا ناتھ نے اپنی آنکھوں سے آئے ہوئے آنسوؤں کو ہاتھ سے جھٹکتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں منشی صاحب۔" ڈاکٹر نے بڑی اپنائیت سے اُن کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "ایک دوسرے کی تکلیف کو کم کرنا اور اُس کا غم بانٹ لینا ہر انسان کا فرض ہے بغیر یہ دیکھے ہوئے کہ وہ کون ہے اور کیا ہے اور یہی ہمارے مذہب کی تعلیم بھی ہے بلکہ ہر مذہب یہی سکھاتا ہے اور اگر ایسا نہیں تو پھر ہم میں اور جانوروں میں فرق ہی کیا رہ جاتا ہے۔ اچھا آداب عرض ہے۔" ڈاکٹر کھڑے ہو گئے۔

"آداب عرض جناب۔" منشی جی بھی اُٹھ کر کھڑے ہو گئے اور اُن کے جانے کے بعد پھر وہیں مونڈھے پر سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر تک وہیں اسی طرح بیٹھے رہنے کے بعد منشی جی کچھ مطمئن سے ہو کر اندر جانے کی سوچ ہی رہے تھے کہ ایک خوبصورت اور نو عمر سا لڑکا ہاتھ میں اٹیچی لئے ہوئے اُن کی طرف بڑھتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ جاتے جاتے ٹھٹکے اور اس کی طرف دیکھ کر بولے۔

"کہیئے!"

"جی مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ ستیش صاحب کا مکان یہی ہے نا؟" ایک صاحب نے اسی دروازے کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"جی ہاں یہی ہے وہ مکان۔"

"تو کیا وہ ملیں گے اس وقت ؟"

"جی وہ اس دنیا میں کہاں ہیں جو ملیں گے۔ وہ اب نہیں ملیں گے کہیں نہیں ملیں گے۔ وہ پھر اُسی مونڈھے پر گرتے ہوئے بولے۔

"ان کا تو دیہانت ہو گیا ہے بھائی اور میں... میں بدنصیب ان کا باپ ہوں۔"

"ارے کب ؟ کیسے ؟" وہ لڑکا بڑی طرح چونکا اور اٹیچی وہیں زمین پر رکھ کر دوسرے مونڈھے پر بیٹھ گیا۔

دو مہینے ہوئے دفتر سے واپس آتے ہوئے ٹرک سے اُن کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا آدھا گھنٹہ بھی نہیں گذرا اور چل دیئے۔"

"اُف مجھے معلوم بھی نہیں ہوا اور ہوتا بھی کیسے جبکہ میری کسی چٹھی کا جواب ہی نہیں دیا کسی نے۔ کیا معلوم تھا کہ اتنی جلدی ایسا ہو جائے گا دوبارہ ملنا بھی نہیں ہوگا۔" اُس نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا اور پینٹ کی جیب سے رومال نکال کر آنکھوں پر رکھ لیا کچھ دیر تک دونوں اسی طرح خاموش بیٹھے رہے پھر منشی جی نے ہی سکوت کو توڑا۔

"آپ کون صاحب ہیں ؟ کہاں سے آئے ہیں ؟ ستیش کے کوئی دوست ہیں ؟"

"جی دوست نہیں بھائی۔" اُس لڑکے نے رومال آنکھوں سے ہٹا کر کہا۔

"میرا نام اونیاش ہے شاید آپ نے ذکر کبھی سُنا ہو گھر میں۔ مرادا باد اسٹیشن پر اُن سے ملاقات ہوئی تھی اور وہ اس حالت میں کہ اُن کو تیز بخار تھا بہن بھی اُن کے ساتھ تھیں۔ میں ٹہلتے ٹہلتے اُدھر سے گذرا تو میری نظر اِن لوگوں پر پڑی وہ بینچ پر لیٹے ہوئے تھے اور بہن اُن کے پاس بہت پریشانی کی حالت میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ میری بہن کا کچھ دن پہلے ہی انتقال ہوا تھا اور اتفاق سے....."

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے میں سمجھ گیا۔" منشی صاحب بھی کچھ چونکتے ہوئے بولے۔

"مجھے ستیش اور موہنی نے بتایا تھا بیٹا اگر تم لوگ اُن کو وہاں نہ ملتے تو نہ جانے کیا ہوتا ستیش تو بخار میں بے سُدھ ہی ہو گیا تھا تم نے اُن کا بہت ساتھ دیا تھا مجھے سب یاد آ گیا اور ایک مرتبہ میری لڑکی نے بتایا تھا کہ تمہاری چیٹھی بھی آئی تھی شاید ستیش کی زندگی میں ہی ....."

"جی ہاں میں نے کئی خط لکھے لیکن جواب ایک کا بھی مجھے نہیں ملا مجھے بڑا تعجب تھا کہ آخر بات کیا ہے پھر سوچا وہ لوگ کہیں اور چلے گئے ہوں گے یا شائد بھول ہی گئے ہوں۔"

"ہاں وہ ایسا تھا کہ یہ دونوں بہن بھائی اپنی ماں کی بیماری میں لگ گئے تھے آکر اُدھر ستیش کو بھی دفتر کا کام زیادہ ہی کرنا پڑتا تھا پھر اُنکی ماں چل بسی اور یہ سب اتنے دُکھی ہو گئے کہ کسی بات کا ہوش ہی نہ آیا۔"

"ارے وہ بھی چلی گئیں۔" اونیاش نے حیرت سے کہا۔ "بڑا افسوس ہوا۔"

"ہاں بھائی وہ بھی چلی گئی۔" منشی جی نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

"اور جبھی سے موہنی پڑی گری رہنے لگی تھی اور اب ستیش کے حادثہ کے بعد سے تو اُس کی طبیعت بہت ہی خراب رہنے لگی ہے۔ کچھ دن کیلئے تھوڑی سنبھلتی ہے اور پھر ویسی ہی ہو جاتی ہے۔ پچھلے مہینے تو ڈاکٹر بہت گھبرا گئے تھے لیکن اُن کی محبت اور کوشش سے کچھ ٹھیک ہو چلی تھی کہ آج پھر سخت قسم کا دورہ اُس کو پڑ گیا ابھی ابھی ڈاکٹر صاحب گئے ہیں تمہارے آنے سے کوئی پانچ منٹ پہلے اور کہہ گئے ہیں کہ چار بجے تک اُس کو اسی طرح تنہائی میں لیٹا رہنے دیا جائے۔ وہ بات یہ ہے کہ آج اس کو اپنا بھائی کچھ زیادہ ہی یاد آیا ہو گا

راکھی بندھن کی وجہ سے۔"

"وہ تو آنا ہی تھا۔" اوِیناش نے پھر رومال سے اپنی آنکھیں رگڑتے ہوئے کہا۔

"میں بھی اسی لئے آیا تھا کہ راکھی بندھواؤں گا دیدی سے لیکن یہاں آپ لوگوں پر کیا کچھ گذر گیا میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔"

"ارے ہاں اندر تو چلو بیٹا کب سے یہاں بیٹھے ہو۔" منشی جی کچھ شرمندہ سے اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ "مجھے بھی نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔"

"کوئی بات نہیں چلئے۔" اور جیسے ہی دونوں نے اندر جانے کے لئے قدم بڑھائے منشی جی کو چکر سا آگیا اور جب اُنہوں نے گرتے گرتے بائیں طرف دیوار کا سہارا لینا چاہا تو اوِیناش نے لپک کر ان کو پکڑ لیا اور پکڑے پکڑے ہی اندر کی طرف لے جاتے ہوئے بولا۔

"اب آپ کو زیادہ گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے بابو جی۔ آپکا بیٹا آپ کے پاس آگیا ہے اور دیدی کی طرف سے بھی آپ پریشان نہ ہوں اپنی بہن کو میں مرنے نہیں دوں گا میری جان بھلے ہی چلی جائے ایک بہن کو کھو کر دوسری کو پایا ہے میں نے۔ آپ اگر دیکھتے تو حیران رہ جاتے کہ ایک شکل کی دو لڑکیاں بھی ہو سکتی ہیں بس معمولی سا ہی فرق ہے جو غور سے دیکھنے پر معلوم ہوتا ہے۔ میں کبھی تصویر دکھاؤں گا آپ کو اپنی بہن کی۔"

"بھگوان تمہیں جیتا رکھیں بیٹا۔ مجھے بھی کچھ آس بندھ گئی ہے۔ تمہاری محبّت شاید موہنی کو بچالے۔" منشی جی کی آنکھوں میں پھر آنسو آگئے تھے۔

"اب یہ آنسو پونچھ لیجئے بابو جی۔" اوِیناش نے ایک بار پھر اُن کے کندھے پر سر رکھتے ہوئے کہا۔ "اب سب کمی پوری ہو جائے گی۔ آپ کو ایک بیٹا مل گیا اور مجھے آپ کی صورت میں اپنے پتا مل گئے آج۔ میرے پتا جی مجھے چار سال کا چھوڑ کر چل دیئے تھے ویسے ماما نے اُن کی کمی کو محسوس نہیں ہونے

دیا لیکن جب وہ بھی چلے گئے بھگوان کے پاس تو میں پتاجی کے لئے اکثر روتا تھا میری ماں پتاجی کے مرنے کے بعد اپنے بھائی کے پاس چلی آئی تھیں جن کا چندوسی میں کافی بڑا لوہے کا بزنس تھا۔ پھر بہن کی شادی کے ٹھیک ایک سال بعد ماما کا ہارٹ فیل ہو گیا اور مجھے لگا کہ میرے چاروں طرف دھوپ ہی دھوپ ہے اور سر کے اوپر ذرا سا سایہ بھی نہیں۔ چلئے۔ اب مجھے یہ دکھ تو نہ ہوگا کہ پتاجی ہوتے تو یہ ہوتا ایسا ہوتا وہ میرے لئے یہ کرتے اور میں ان کی خوشی کی خاطر ایسا کرتا۔"

"ہاں بیٹے یہ سب تمہاری نیکی اور شرافت کی بات ہے ورنہ آج کل کے لڑکے ایسا کہاں سوچتے ہیں۔ بڑی بھاگیہ وان ہے تمہاری ماں کہ اس نے تم جیسے لائق بیٹے کو جنم دیا۔ تم جیسے سپوتوں سے ہی ہمارے دیش کی شان ہے بھگوان تمہیں ہمیشہ سکھی رکھیں۔ ہاں اپنی دوسری بہن سے تو تم ملے ہی نہیں۔" ایک مدت کے بعد منشی دینا ناتھ کے چہرے کو ہلکی سی مسکراہٹ نے چھوا۔

"لکشمی بیٹے کہاں ہے تو، اِدھر تو آ، اپنے بھائی سے نہیں ملے گی؟"

اور لکشمی مسکراتی ہوئی رسوئی سے نکلی اور اویناش کے سامنے آکر شرماتے ہوئے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

"یہ تو ابھی کھڑکی سے جھانک کر دیکھ رہی تھیں اور میں سوچ رہا تھا کہ دیدی سے ملتی ہوئی لڑکی کون ہو سکتی ہے ان کا تو مجھے دھیان ہی نہیں آیا۔"

"ارے بیٹھو بھئی کہاں چلیں۔" اویناش نے محبت اور شرارت کے ملے جلے لہجہ میں کہا۔

"چائے لے آؤں آپ کے لئے۔" لکشمی نے لجاتے ہوئے کہا اور اٹھ کر چلی گئی۔

"ارے کھانے کو تو پوچھا ہوتا پہلے۔" اُس کے باپ نے ذرا تیز آواز سے کہا۔

"میں نے سوچا چائے سے ذرا تھکن اُتر جائے تو پھر کھانا نکالوں۔"

"ارے نہیں کھانا نہیں ۔ کھانا تو میں نے ایک بجے کھا لیا تھا دیکھو اب بھی تھوڑا بچا ہوا ہوگا ٹفن میں ۔ ہماری ماں راستے میں باہر کی کوئی بھی چیز کھانے کو منع کرتی ہیں ۔ اپنے ہاتھ سے کھانا بنا کر ساتھ دیا کرتی ہیں ۔" اوِیناش نے کہا اور خاموشی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا ۔ تھوڑی ہی دیر میں لکشمی چائے بنا کر لے آئی ۔ اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے تینوں نے ایک ساتھ چائے پی ۔ عرصہ کے بعد گھر میں تھوڑی سی رونق نظر آئی تھی ۔ سب کے چہروں پر ہلکی سی خوشی کے سائے لہراتے معلوم ہوتے تھے ۔ اوِیناش برابر لکشمی سے چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا تاکہ اُس کی جھجک کچھ کم ہو اور وہ اُس سے تھوڑی سی اور بے تکلف ہو جائے اور انہیں باتوں میں جب ساڑھے تین بج گئے تو اوِیناش گھڑی دیکھتے ہوئے لکشمی سے بولا ۔

"ساڑھے تین بج رہے ہیں چار بجے تک دیدی کو جگا لیا جائے بس ہاں ہاں اور کیا اور بھئی لکشمی تم دونوں کے لئے راکھیاں ہونی چاہئیں اور مٹھائی اور کیا کیا ہوتا ہے وہ ۔" منشی جی کچھ یاد کرتے ہوئے بولے ۔

"ہاں بابو جی وہ میں سب بتاتی ہوں ابھی آپ کو ۔" لکشمی نے چہک کر کہا ۔

"بھئی لکشمی میں تو اپنی دیدی سے بندھواؤں گا راکھی تم سے کیا مطلب ۔"

"اور میں زبردستی ہی باندھ دوں تو؟" لکشمی نے مٹکتے ہوئے کہا ۔

"اچھا بھئی اچھا ۔" اوِیناش نے اُٹھتے ہوئے کہا اور کچھ دیر تک خاموشی سے ٹہلنے کے بعد بولا ۔

"دیدی ہیں کدھر؟"

"وہ سامنے والے کمرہ میں لیٹی ہیں بھیّا ۔" اوِیناش نے جاتے جاتے حیرت اور مسرت سے لکشمی کو پلٹ کر دیکھا ۔ اس لفظ سے اُس کے کان آج تک نا آشنا تھے ۔ بھیّا کہہ کر تو اُس کو آج تک کسی نے بھی نہ پکارا تھا اُس کا تو سب نام ہی لیتے آئے تھے اُس کے ماما کے تینوں بچے بھی اُس سے بڑے تھے اُس کا دِل چاہا کہ اپنی اس چھوٹی بہن کو بڑھ کر گلے سے لگا لے لیکن کچھ سوچ کر وہ رُکا اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے

موہنی کے کمرہ کی دہلیز میں جاکر کھڑا ہو گیا۔ سامنے ہی بستر پر موہنی سیدھی لیٹی ہوئی تھی اویناش دبے قدموں سے اُس کے پلنگ کے پاس پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا اور اُس کے چہرے پر نظریں جما دیں پیلا پیلا چہرہ نیند کی حالت میں کچھ عجیب ہی نظر آرہا تھا جیسے زرد رنگ کا گلاب جس میں کبھی گلاب کی سُرخی جھلکتی ہو گی لیکن اب تو بس زردی ہی زردی ہے بار بار گہرے دُکھوں کی پرچھائیاں چہرہ پر لہرا جاتی ہیں جیسے کوئی بہت دُکھ بھرا سپنا دیکھ رہی ہو۔ آہ! دنیا کی سب سے بد نصیب لڑکی تنہائیوں اور ویرانیوں کے سوا جسے آج تک کچھ نہیں ملا۔ محرومیاں جسکا مقدّر بن چکی ہیں جس کے چہرے پر دیوی دیوتاؤں جیسا تقدّس اور پاکیزگی ہے۔ اپسراؤں جیسا حُسن ہے ایسا حُسن جس نے زردی میں بھی اپنی آن بان نہیں کھوئی ہے اور فرشتوں جیسی معصومیت اور صبر ہے لیکن اس ظالم سماج نے اُس کی خوشیاں تمنّائیں اُس کا صبر سکون سب ہی کچھ اُس سے چھین لیا ہے۔ سسرال کی حد درجہ بے رحمی اور سفّاکی اور شوہر کی مسلسل بے رُخی نے اُس کو ایک زندہ لاش میں تبدیل کر دیا۔ اُسے اپنے چاروں طرف دُکھ اور مایوسی کے اندھیرے اور بھیانک غار کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آیا۔ آہ۔ بے بسی اور لاچاری حد سے گذر گئی اور پھر وہ مجبور ہو گئی کہ اپنے ماں باپ کی نرم محبّت بھری آغوش اور بڑے بھائی سُکیش کے پیار کی گھنی چھاؤں میں آکر دم لے لے لیکن رفتہ رفتہ وہ سائے بھی چھٹنے شروع ہو گئے اور پھر رہ گئی وہی تپتی ہوئی جھلسا دینے والی دُکھوں کی دھوپ جس کی تاب نہ لاکر دھیرے دھیرے وہ پھر رینگنے لگی اُسی راستے کی طرف جو اُس گہرے غار تک جاکر ختم ہو جاتا ہے۔ اویناش کی آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑی لگ گئی۔ بہت دیر وہ اسی حالت میں بیٹھا رہا اور پھر چونک کر اُس نے گھڑی دیکھی ساڑھے چار بج رہے تھے وہ اُٹھا اور باہر آکر لکشمی کو آواز دی جو اتنی دیر سے نہ معلوم کسی کام میں لگی ہوئی تھی۔

"آئی بھیّا" کہتی ہوئی وہ دوسرے کمرہ سے ایکدم ہی باہر نکل آئی۔

"بھئی اب تم جگا لو آکر دیدی کو۔"

"اچھا!" وہ تیزی سے کمرہ میں جاکر موہنی کے اوپر جھک گئی۔

"دیدی!" پہلے اُس نے آہستہ سے اُس کا ماتھا چھُوا لیکن وہ یونہی پڑی رہی اویناش بھی آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ دوسری آواز پر اُس کی پلکوں کو ذرا سی جنبش ہوئی پھر اُس نے دھیمے سے آنکھیں کھول دیں اور سوالیہ نظروں سے لکشمی کو دیکھنے لگی۔

"دیدی بس اب جاگ جاؤ بہت دیر ہو گئی۔" اُس نے بہت ہی پیار سے کہا پھر اویناش کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "دیکھو تو کون آیا ہے۔"

"کون ہے؟" موہنی نے بڑی مدھم سی آواز میں پوچھا۔

اویناش بھی بالکل قریب آکر لکشمی کے پاس ہی کھڑا ہو گیا تھا موہنی نے اُسے دیکھا اور خاموشی سے کچھ دیر تک یونہی پڑی دیکھتی رہی۔

"دیدی! اپنے بھیّا کو بھول گئیں اتنی جلدی۔ ایسی بھی بہنیں ہوتی ہیں کہیں۔" اویناش نے پھیکی سی مسکراہٹ چہرے پر لاتے ہوئے کہا اور پھر موہنی کی زبان گُنگ ہو گئی۔ کچھ دیر تک اسی طرح بے حس و حرکت پڑے رہنے کے بعد اچانک ہی آنکھوں میں جیسے آنسوؤں کا ایک سیلاب اُمنڈ آیا۔ وہ دونوں بھی خاموش کھڑے آنسو بہاتے رہے اور پھر موہنی کو جیسے بجلی کا کرنٹ چھو گیا ہو۔

"اویناش!" ایک بھرائی ہوئی لمبی سی چیخ کمرہ میں گونج اُٹھی اور بے ساختہ تیزی سے دونوں ہاتھ اوپر کو اُٹھاتے ہوئے بیٹھنے کی کوشش میں وہ تھوڑی سی اُٹھی اور پھر گر گئی پیچھے کی طرف۔

اویناش بڑھا اُس کی گردن میں ہاتھ ڈال کر تھوڑا سا اُٹھایا اور اپنی مضبوط باہوں میں اُس کا نحیف و نزار جسم سنبھال کر اُسے اپنے ساتھ لپٹا لیا

کچھ دیر تک دونوں اسی طرح روتے رہے پھر اوینا شں نے اپنے آنسو پونچھ لئے اور اُسے آہستہ سے بستر پر لٹاتے ہوئے بولا۔

"اب چپ ہو جاؤ دیدی بس ہو لیا رونا۔ تمہیں میری قسم جو اب تم ایک آنسو بھی نکالو۔"

"بھیا ہمیں چھوڑ کر چلے گئے اوینا شں لیکن میں نہیں روئی اُس سے پہلے ماں بھی ایک دن اچانک ہی چلی گئی تھیں میں جب بھی نہیں روئی تھی روئی بھی تو بہت کم سے چُپ چُھپا کر کہ بابو جی نہ دیکھ لیں لکشمی کو پتہ نہ لگ جائے کہ میں رو رہی ہوں۔ آج مجھے اچھی طرح رو لینے دو بھیا۔" موہنی نے پھر اپنا آنچل ٹٹولا۔

اوینا شں نے اپنے رومال سے اُس کے آنسو پونچھے پھر بولا۔

"تمہارے اس طرح رونے اور غم کرنے سے بھیا لوٹ آئیں گے۔؟ یہ تو سوچو۔ جو بیت گیا اُس کی مت سوچو جو آنے والا ہے اس کی فکر کرو۔ ادھر دیکھو دیدی میری طرف۔ کیا تم مجھے اپنا بھائی نہیں مانتیں؟"

"مانتی کیوں نہیں۔" موہنی نے سر اُٹھا کر اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"بس تو تم اب نہیں رو سکتیں۔ میں خود جل جاؤں گا دیدی لیکن تمہارے اوپر آنچ نہیں آنے دوں گا اور اگر تم یونہی روتی رہیں اور بیمار بنی رہیں تو۔ تو تمہاری قسم میں کہیں دور بہت دور چلا جاؤں گا۔"

"نہیں نہیں ایسا نہ کہو اوینا شں ایسا نہ کہو۔ میں اب نہیں رؤں گی بالکل بھی نہیں تم نے اپنی سوگندھ دی ہے نا اب میں کیسے رو سکتی ہوں میرے بھیا۔" اُس نے پھر اُس کے کاندھے پر اپنا سر رکھ دیا۔

"اچھا تو پھر ہنس دو اب ذرا سا۔ ہنسو۔ ہنسو نا دیدی اور جیسے ہی موہنی کے چہرے پر ہلکی سی ہنسی آئی اوینا شں تالی بجا کر زور سے ہنس پڑا۔ اُس کو

اس طرح ہنستے دیکھ کر لکشمی بھی بے ساختہ ہنس پڑی۔ ہنسی کی آواز سنکر منشی دینا ناتھ جی نے حیرت اور مسرت سے کمرہ میں آکر جھانکا اور بولے۔

"ارے بھئی وہ راکھی کا حساب کتاب کب ہوگا۔ ہم نے تو سب کام کر دیا۔"

"ارے ہاں۔" اویناش اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ "راکھی تو ہم بھول ہی گئے اور ہم آئے کس لئے تھے۔ اُٹھو بھئی دیدی باہر چلو یہاں تو جی گھبرا رہا ہے۔" اُس نے موہنی کا ہاتھ پکڑ کر کھڑا کر دیا اور جب ڈگمگاتے ہوئے اُس نے باہر کی طرف قدم بڑھایا اویناش نے اُس کے دونوں کاندھے پکڑ لئے اور اپنے سہارے لے جانے لگا۔

"نہیں میں خود چلی جاؤں گی۔" مسکراتے ہوئے اُس نے اویناش کے ہاتھ ہٹائے اور ہلکے ہلکے قدم اُٹھاتی باہر صحن میں آکر کھڑی ہو گئی۔ لکشمی برآمدے میں سے کرسی اُٹھا لائی اور اُس پر اُسے بٹھا دیا پھر اندر سے چوکی اُٹھا لائی اُس پر پھول دار کپڑا ڈالا اور اویناش کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اُس پر بٹھانا ہی چاہتی تھی کہ وہ دھم سے خود ہی گر گیا اور اُس کو گھورتے ہوئے بولا۔

"میں خود ہی بیٹھ جاتا، دھکّا دینے کی ضرورت کیا تھی۔"

"بس اب اترا ؤمت زیادہ بیٹھ جاؤ سیدھی طرح ورنہ....."

"ورنہ کیا؟" اویناش نے بناوٹی غصّہ سے اُس کی طرف دیکھا۔

"کچھ بھی نہیں۔"

موہنی بھی چپکے چپکے بیٹھی مسکراتی رہی پھر لکشمی تھالی میں راکھیاں اور مٹھائی لیکر موہنی کے پاس آئی اور بولی۔ "اُٹھو دیدی دیکھ کیا رہی ہو۔"

موہنی آہستہ سے اُٹھی ایک راکھی اُٹھائی اور جھک کر اویناش کے بڑھے ہوئے ہاتھ پر باندھنے کی کوشش کرنے لگی لیکن اُس کا ہاتھ بار بار کانپ جاتا تھا اور راکھی بندھ نہیں پا رہی تھی اویناش نے اُس کے چہرے کی طرف دیکھا اور روٹھ کر ہاتھ ہٹاتے ہوئے بولا۔

"یہ کیا دیدی ؟ پھر آنسو ؟ میں نے تو تمہیں قسم دی تھی جاؤ میں نہیں بندھواتا راکھی واکھی۔" موہنی نے بڑھ کر اُس کا ہاتھ پکڑا اور دوبارہ باندھتے ہوئے کہا۔

"یہ تو خوشی کے آنسو ہیں پگلے ان پر قسم وسم بالکل نہیں چلتی۔" راکھی باندھ کر ایک مٹھائی کا ٹکڑا اُس کے منھ میں دیتے ہوئے ماتھے پر ٹیکہ بھی کر دیا۔ اوِیناش نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک لفافہ نکالا جس میں سے سو کا ایک نوٹ جھانک رہا تھا اور موہنی کے ہاتھ میں تھما دیا جس کو اُس نے آنکھوں سے لگایا اور آنسوؤں کو پیتے ہوئے واپس کرسی پر جا بیٹھی۔ پھر لکشمی کی باری آئی۔ راکھی باندھتے ہوئے اُس کے ہاتھ میں بھی ہلکی سی لرزش پیدا ہوئی اور بعد میں جب اُس نے مٹھائی کا ٹکڑا اُس کے منہ میں دینا چاہا تو اوِیناش نے شرارت سے اپنے ہونٹ بھینچ لئے۔

"اچھا۔ منہ نہیں کھولو گے تو میں پورے منہ پر مل دوں گی اِسے۔"

"ارے نہیں۔" بوکھلا کر اوِیناش نے پورا منہ کھول دیا اور اسی طرح ہنستے ہنساتے رات ہو گئی۔

دو دن اِسی طرح گذر گئے اوِیناش موہنی کی وجہ سے ہر وقت کوئی نہ کوئی چٹکلہ تلاش کرتا رہتا اور وہ بھی ہولے ہولے مسکراتی رہتی۔ منشی دیناناتھ بھی ان سب کو ہنستا مسکراتا دیکھ کر مطمئن سے نظر آتے۔ اوِیناش کے آجانے سے اُن کے گھر کے کونے کونے میں بکھری اُداسیوں کو اچانک ہی ان دیکھی خوشیوں نے نگل لیا تھا۔ سونی سونی سی خزاں بہار کے ہلکے ہلکے جھونکوں میں بدل گئی تھی۔ جس میں موہنی اور لکشمی کے مستقبل کے اندیشے بھی دور کہیں دھند میں لپٹ کر سو گئے تھے۔ تیسرے دن اوِیناش نے موہنی سے کہا۔

"دیدی اب میں تمہیں ساتھ لیکر جاؤں گا۔ تم تیاری شروع کر دو۔ آج ۷ تاریخ ہے نا۔ ۱۰ تک میرا وہاں پہونچ جانا ضروری ہے۔ ایک فارم بھرنا ہے تاریخ نکل گئی تو بڑا نقصان ہو جائے گا۔"

"لیکن کیوں مجھے کیوں! حیرت سے موہنی کا منہ کھلا رہ گیا۔
"کیوں کا کیا سوال ہے۔ چلنا تو تمہیں پڑے گا ہی۔ ماں نے چلتے چلتے کہا تھا تمہیں لیکر آنے کے لئے۔ وہ تمہارے لئے اتنی بے چین ہو رہی ہیں روز ہی یاد کرتی ہیں تمہیں اور روتی ہیں۔ وہ تو کہہ رہی تھیں اگر موہنی یہاں آکر میرے سامنے ہی راکھی باندھتی تو اچھا تھا۔ میں نے کہا میں ہی ہو آتا ہوں وہ آسکیں گی یا نہیں کیا کہا جا سکتا ہے اس کے لئے اور پھر یہ ہے کہ تمہاری حالت کو دیکھتے ہوئے تو لے جانا اور بھی ضروری ہے۔ بھائی صاحب وہاں ڈاکٹر ہیں جتنی دیکھ بھال تمہاری وہاں ہو سکے گی یہاں ہو ہی نہیں سکتی تمہیں تو خود سوچنا چاہیئے۔
ڈاکٹر سریندر کا نام آتے ہی موہنی ایکدم گم سم سی ہو گئی۔ اس کے ذہن کے پردے پر پچھلی تمام تصویریں ایک کے بعد ایک آنی شروع ہو گئیں اس نے سر اٹھا کر دیکھا اویناش دوسرے کمرہ میں سونے کے لئے جا چکا تھا وہ آہستہ سے اٹھی اور اپنے بستر پر جا کر گر گئی۔ اور پھر یادیں ہی یادیں اُسکے چاروں طرف منڈلانے لگیں۔ جن میں ہر طرح کی یاد شامل تھی انتہائی تکلیف دہ اور دکھ بھری بھی اور تھوڑے سے عرصہ کی کچھ سہانی اور اطمینان بھری بھی۔
دکھ بھری یادوں کا تعلق تھا اُس کی اپنی سسرال سے اور سہانی یادیں تھیں اویناش اُس کی ماں اور سریندر سے اچانک ملاقات کی یاد جس میں ان سب کی حد درجہ محبت اور ہمدردی تھی اور سریندر کے ہلکے ہلکے میٹھے میٹھے سے خلوص کی تپش تھی لیکن اُس وقت تو اُس کو کچھ بھی اچھا نہیں لگا تھا اپنی پریشانی میں۔ اُس وقت تو وہ اُن سب کی شفقت اور مہربانیوں کے بوجھ سے دبی دبی انتہائی وحشت زدہ اور اُلجھا اُلجھا سا محسوس کر رہی تھی اپنے آپ کو۔ نہ معلوم کیوں تھا۔ وہ سب تو اُس کا دکھ بانٹ رہے تھے اُس کی اس وقت کی پریشانیوں کو کم کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ اور پھر اچانک ہی اُس کی زندگی کی سب سے بھیانک یاد اُس کے ذہن کے پردے پر اُبھری جس میں اُسکے

پیارے بھائی ستیش کی بہت سی تصویریں اُس کے سامنے آنی شروع ہو گئیں۔ اُسے یاد آیا کہ ایک بار یعنی آخری مرتبہ جب ستیش اُس کو لینے اُس کی سسرال پہونچا تو اچانک ہی وہاں جاکر اُس کی طبیعت خراب ہو گئی اور پورے ایک ہفتہ تک اُس کو وہاں رکنا پڑ گیا وہاں اُس نے اُس کی جو حالت دیکھی بُری طرح کانپ کر رہ گیا اُس کے چہرے پر گہری اداسی کی لکیریں تو وہ ہر دم دیکھتا تھا لیکن اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ وہ اُس کو آنسو پونچھتی ہوئی نظر آجاتی تو وہ بہت دُکھی ہو جاتا اور پھر پیار سے جب وہ اُس سے وجہ معلوم کرتا تو ضبط کرنے کے باوجود وہ پھپک پھپک کر رونے لگتی اور منہ سے کچھ نہ بولتی اور ستیش ایک گہری سانس لے کر خاموش ہو جاتا لیکن اداسی اور بے چینی اُس کی بیمار آنکھوں سے برابر جھانکتی رہتی اس پورے آٹھ دن کے عرصہ میں اُس کے بہنوئی پرکاش نے ایک بار بھی اُس کے پاس بیٹھ کر اُس کی خیریت نہ پوچھی تسلّی یا دلجوئی کے دو بول تو دور کی بات رہی۔ بس خاموشی سے ایک یا دو منٹ کیلئے اُسکے کمرہ میں ضرور آتا چہرے پر گھبراہٹ لئے ہوئے جیسے چھُپ کر آیا ہو اور آہستہ سے دوا کی کوئی شیشی۔ پڑیا یا گولیوں کا پیکٹ بیوی کے ہاتھ میں تھما دیتا اور فوراً ہی واپس چلا جاتا۔ کبھی ایسا ہوتا کہ لیٹے لیٹے ہی ستیش اُس کی ماں باپ اور بیوہ بہن کی انتہائی حقارت آمیز اور چبھتی ہوئی نظریں اپنی طرف اُٹھتی ہوئی دیکھتا اور ساتھ ہی کبھی تیز اور مدّھم آوازیں بڑبڑانے کی بھی اُس کے کانوں سے آکر ٹکرا جاتیں اور ایک دِن تو وہ ہوا جس کے لئے وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اُس کی آنکھ ذرا سی دیر کے لئے لگی ہی تھی کہ تیز آوازوں کے شور سے گھبرا کر وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

ٹسوے بہانے کی بالکل ضرورت نہیں چلی جاؤ یہاں سے اپنے بھائی کے ساتھ کوئی کام نہ دھام اوپر سے رونا دھونا اور چوبیس گھنٹہ کی بیماری جیسے دوا علاج کے لئے بہت پیسہ لیکر آئی تھیں باپ کے ہاں سے۔ ایک بہن کی بیماری ہی کیا

کم تھی کہ بھائی بھی آکر بیمار ہو گئے۔ ارے بھائی یہ گھر ہے کوئی ہسپتال تھوڑا ہی ہے۔ موہنی کے سسر بابو کِدار ناتھ چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے۔

"اجی میں نے تو تم سے پہلے ہی منع کیا تھا۔" اُس کی ساس بھی تڑخ کر اُٹھی۔ مگر تم میری سنتے کب ہو۔ میرے برکاش کے لئے لڑکیوں کی کمی تھی کیا تم ہی منشی دینا ناتھ کے لئے گڑھے جاتے تھے۔ اب دیکھ لیا نہ مزا۔"

"مجھے کیا پتہ تھا۔" کِدار ناتھ نے ناگواری سے کہا۔

"پتہ کیسے نہیں تھا۔ میں کہتی ہوں رام پرشاد جی کی لڑکی میں کیا برائی تھی ایک ذرا کالی ہی تو پڑھتی تھی۔ ہمارے گھر آکر سب ٹھیک ہو جاتی۔ اب دیکھ لو کتنا دیا ہے لڑکی کو۔ پانچ ہزار تو ٹیکے میں دے ڈالے اور نقدی میں پورے پچیس ہزار گن کر اُٹھے پچیس ہزار۔ اور جہیز بھی اتنا ہے کہ گھر میں جگہ نہیں رکھنے کو۔"

"ارے کس کس بات کو روتی رہو گی ماں۔ یہاں تو نصیب ہی ایسے ہیں کہ نہ جہیز ہی ڈھنگ کا ملا اور نہ روپیہ ہی۔" اُس کی نند بملا نے بھی ٹکڑا لگایا۔

"جی ہاں یہاں تو پندرہ ہزار ہی مانگے تھے جس میں دس ہزار دیئے اور وہ بڈھا منشی ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔" اُس کی ساس جوش میں آکر کھڑی ہو گئی۔

"ارے ایسے بھیک منگوں میں ہی کرنا ہوتا تو لڑکے کی پڑھائی میں اتنے پیسے کیوں لگاتے۔ ایسا اچھا لڑکا لے لیا اور دیا کیا۔ اتنا تو دیدیتے کہ کسی کو دکھاتے لاج تو نہ آتی۔"

"وہ تو کیا ہوتا تم نے تو گلے کی ٹیپ کو کھلوا کر اپنی بات بھی کھوئی۔" بملا پھر بولی۔

"ارے لڑکے کی ماں کو تو غریب سے غریب بھی گہنا دے دیں ہیں۔"

"ارے اُس کا خود کا زیور ہی کونسا بھاری تھا۔ چار پانچ تولہ ہو گا مشکل سے۔" بملا نے کہا اور اُٹھ کر رسوئی کی طرف چلی گئی۔

اور اتنے پر سونے پہ سہاگہ یہ کہ ذرا سی بات کہہ دو تو روئے گی اتنا کہ گھر

بھر جائے۔ نہ بابا نہ ہم تو بھر پائے اب۔ اُس کی ساس بھی اپنا ترکش خالی کرتے ہوئے گلاس اُٹھا کر نل کی طرف چل دی۔

ستیش کے دِل میں درد کی ایک ٹیس سی اُٹھی اور تیروں کی اِس بوچھار کی تاب نہ لاکر وہ ایکدم ہی بستر سے کھڑا ہو گیا اور کمرہ سے باہر آتے ہوئے نل کے پاس کھڑی اُس کی ساس کے اوپر اُچٹتی ہوئی نظر ڈال کر بولا۔

اچھا ماں جی ٹھیک ہی سب جو آپ کہہ رہی ہیں۔ میں موہنی کو لیکر ابھی چلا جاتا ہوں اب یہ کبھی اِس گھر میں نہیں آئے گی آپ چنتا نہ کریں۔ ہم غریب ضرور ہیں پر اتنے بے غیرت نہیں جتنا آپ سمجھتی ہیں۔ کوئی بھی آدمی جان بوجھ کر اتنی باتیں سُننا پسند نہیں کرے گا۔ بڑے سلجھے ہوئے انداز میں وہ کہتا رہا یہ انسان کے حالات ہی ہوتے ہیں جو اُس کو اِس طرح بے بس کر دیتے ہیں کہ وہ چاہتے ہوئے بھی کچھ نہیں کر پاتا مصیبت یہ ہے ہم چوری نہیں کر سکتے کسی کے گھر میں ڈاکہ نہیں ڈال سکتے اور غلط راستوں پر چل کر کسی کے گلے پر چھُری پھیرنا بھی ہمارے بس کی بات نہیں اور نہ ہی گلے میں جھولی ڈال کر ہم بھیک ہی مانگ سکتے ہیں۔ یہ سب تو بھگوان کے ہاتھ میں ہے کہ اُس نے سب کو ایک جیسا کیوں نہیں بنایا۔ اب رہی محنت اور کوشش سے کام کرنے کی بات تو وہ سب ہی ایک جیسی کرتے ہیں اور ایمانداری کے ساتھ ہم بھی کرتے ہیں لیکن تقدیر سے کوئی لڑ نہیں سکتا۔ اور ....."

"چلو چلو ہمیں مت پڑھاؤ یہ بھاشن کسی اور کو دینا جا کر" موہنی کی ساس اُس کی بات کاٹ کر بے رحمی سے غرّائی۔

"ہاں ٹھیک ہے۔ مجھ سے غلطی ہوئی۔ بات اُسی سے کی جاتی ہے جو اُسے سمجھنے کے قابل ہو" ستیش جو بے حد دل گرفتہ ہو رہا تھا آہستہ سے بڑبڑایا اور موہنی کی طرف پلٹ کر بولا۔

"چلو موہنی تیار ہو جاؤ۔ میں جلدی سے جلدی یہاں سے نکل جانا چاہتا ہوں" یہ کہتے ہوئے وہ موہنی کے ساتھ اُس کے کمرہ کی طرف مڑا۔ ... کے کمرہ میں موہنی

کا شوہر پرکاش کہیں جانے کے لئے تیار ہوکر چائے کی پیالی ہاتھ میں لئے سب کچھ بیٹھا سُن رہا تھا۔ جونہی ستیش کی نظر اُس پر پڑی کچھ دیر کے لئے وہ وہیں کھڑا رہ گیا۔ اُسکے گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ پرکاش یہ سب باتیں سُن کر بھی اتقدر خاموشی سے بیٹھا رہے گا۔ اُس کی بے حسی پر ستیش حیران رہ گیا اور پھر امید کی آخری کرن کے سہارے وہ پرکاش کے پاس جاکر دیوار سے لگ کر کھڑا ہوگیا جیسے ہی دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں ستیش سے خاموش نہ رہا گیا۔

"پرکاش!" اُس کی لرزتی آواز کمرہ میں گونج گئی۔ "میں موہنی کو لیکر جارہا ہوں پرکاش ہمیشہ کے لئے اور اب اُس کو کبھی یہاں نہیں بھیجوں گا۔ مجھے نہیں معلوم تھا بھائی کہ اِس زمانے میں دھرم ایمان سب کچھ پیسہ ہی ہے جس میں آدمی کی ساری اچھائیاں دب کر رہ جاتی ہیں۔ ہیرا جیسی لڑکیوں کی ناقدری ہوتی ہے۔ اُن کو صرف پیسوں کے لئے جو ایک آنی جانی چیز ہے اور سامان کے لئے جو ٹوٹ پھوٹ بھی سکتا ہے ہمیشہ قائم نہیں رہتا، اتنے دُکھ دیئے جاتے ہیں کہ خود لوٹ لوٹ کر بکھر بکھر کر آخر موت کے دروازے سے آلگتی ہیں۔ کسی کو گولی مار کر قتل کر دینے میں اور اِس طرح تڑپا کر اور سِسکا کر مار دینے میں کیا فرق ہے آخر اور پھر بھی اِس قتل کو ہم قتل نہیں کہتے یہ کتنا بڑا ظلم ہے پرکاش کتنی بڑی بے انصافی ہے۔"

"تو میں کیا کر سکتا ہوں آپ خود ہی سوچئے ماں اور پتاجی کے سامنے میں کیسے بول سکتا ہوں آپ مجھ سے یہ سب کیوں کہہ رہے ہیں۔" پرکاش نے انتہائی بے دردی سے جواب دیا۔

"ہاں تم کچھ نہیں کر سکتے کچھ بھی نہیں میں نے تم سے یہ سب کہا یہ میری بھول تھی۔ لوگ کہتے ہیں پتھر بھی موم جاتے ہیں سمجھانے سے لیکن پتھر تو پتھر ہی ہوتے ہیں وہ کیسے موم ہو سکتے ہیں۔" ستیش سر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے ہوئے وہیں زمین پر دروازے کے پاس بیٹھ گیا۔

"یہ کیا ناٹک رچار کھا ہے" پر کاش کی ماں دندناتی ہوئی کمرہ میں داخل ہوئی۔ اُس سے یہ ڈھکرارونے سے کچھ نہیں ہوگا وہ بچّہ تو ہے نہیں کہ تم اُس کو پھُسلا لوگے کیا وہ نہیں دیکھتا کہ اُس کے دوستوں کی بیویاں کیا کچھ لارہی ہیں جہیز میں۔ ارے کاریں لارہی ہیں کاریں اور تمہارے سامنے ایک اسکوٹر کا نام لے دیا تھا تو سانپ سونگھ گیا تھا سب کو۔ لیکن تمہاری تو مثل ہے کہ چوری اوسینہ زوری۔ الٹی سیدھی چیزیں دیکر بیمار بہن کو ہمارے گلے ڈال دیا۔ جب دیکھو منہ لپیٹے پڑی رہے ہے کبھی سر میں درد ہے تو کبھی دِل ہل رہا ہے کبھی سردی ہے تو کبھی بخار چڑھا ہے۔ اوپر سے احسان جتانے چلے ہیں بیچارے خبردار جواب اُس سے ایک بات بھی کی تم نے بس اب تم ہمارا پیچھا چھوڑو بھیّا ہم تو پریشان ہو گئے۔ ہماری شرافت دیکھو کہ ہم تمہاری ایک بات پر خوشی خوشی بدا کر کے لے آئے۔ تم نے کہا تھا کہ میری نوکری لگنے والی ہے میں سب کمی پوری کردوں گا۔ ہم اتنے دن خاموش بیٹھے رہے لیکن تم نے ابتک بھی کچھ نہ کیا۔ آخر کوئی حد بھی ہے۔ اُسوقت تمہارے باپ نے ہاتھ جوڑ رے اپنی پگڑی اُتار کر ہمارے پیروں میں ڈال دی ہم نے سوچا چلو کوئی بات نہیں اور چپ چاپ لوٹ آئے اب سر نیچا کئے کیوں بیٹھے ہو جواب کیوں نہیں دیتے اُس نے تیز آواز میں کہا۔" ستیش سر کو پکڑے خاموش بیٹھا رہا اس کی طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی سر بُری طرح چکرا رہا تھا۔ کوشش کرنے پر بھی وہ نہ تو کچھ بول سکا اور نہ اُس سے اُٹھا ہی گیا۔

"اب اُٹھو گے بھی یا یہیں اسی کمرہ میں ڈیرہ جمانے کا ارادہ ہے؟" زہر میں بجھا ہوا یہ فقرہ ستیش کے دِل پر بجلی بن کر گرا بڑی مشکل سے کواڑ کو پکڑ کر وہ کھڑا تو ہو گیا لیکن جیسے ہی قدم بڑھائے پیر ڈگمگانے لگے۔ موہنی جو صحن میں ایک طرف کھڑی سب دیکھ اور سُن رہی تھی بھاگ کر آئی اور بھائی سے لپٹتے ہوئے بولی۔

"چلو بھیّا بس بہت ہو چکا۔ میری وجہ سے تمہیں اتنا کچھ سننا پڑ رہا

ہے اور میں زندہ ہوں مجھے پہلے ہی موت کیوں نہیں آگئی بھیّا۔ ارے تمہارا بدن تو جل رہا ہے بخار کتنا بڑھ گیا ہے تمہارا چلو پہلے تمہیں دوا کھلا دو۔" اور پکڑ کر اندر کمرہ میں لے گئی اور بستر پر اُسے لٹا کر پانی لینے باہر آئی تو دیکھا کہ اُسکی ساس اُس کے کمرہ سے سب سامان اُس کے جہیز کا نکال نکال کر باہر پھینک رہی تھی اور ساتھ ہی بڑبڑاتی جا رہی تھی۔

پہلے تو موہنی نے ستیش کو کوئی دوا کھلائی اور واپس اپنے کمرہ میں آکر اپنا سامان سمیٹتے ہوئے بولی۔

"میں خود باندھ لوں گی سب سامان اُٹھا کر۔ آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں۔"

"لو باندھو اور ہمارا سب سامان ساڑیاں اور زیور پہلے الگ نکال کر رکھو۔"

"مجھے آپ کی کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ میں ابھی سب الگ کئے دیتی ہوں آپ بے فکر رہیں۔" موہنی نے بھی اسی طرح تیز ہو کر کہا۔

"مجھے جواب دے رہی ہے شرم نہیں آتی یہ زبان اپنی ماں کے ساتھ چلانا جا کر۔"

"میں کسی کے ساتھ زبان نہیں چلاتی پانی سر سے اونچا ہو جائے تو بولنا ہی پڑتا ہے۔ آپ میرے حلق میں ہاتھ ڈال کر مجھے بُلوا رہی ہیں۔ میں انسان ہوں پتھر کی مورتی نہیں جو نہ بول سکتی ہے نہ سوچ اور سمجھ سکتی ہے۔ نہ اُس کی کوئی خواہش ہوتی ہے نہ ارمان اور نہ ہی بے عزتی کا احساس اُس کو ہوتا ہے۔ اور نہ میرا دل ہی آپ کا جیسا ہے پتھر کا ٹھوس ٹکڑا جو نہ پگھل سکتا ہے اور نہ پسیج سکتا ہے۔"

"ہاں ہاں اور ریخ سب کچھ کہہ لے۔ میں تو ہوں ہی ایسی۔ اب دیکھو بھیّا کی شیری پر کیسی آنکھیں نکال رہی ہے میرے اوپر۔ ویسے ہر دم مرگلی سی بنی

پڑی رہے ہے۔ بڑی آئی بچاری۔ آپ کا دِل تو پتھر کا ٹکڑا ہے۔" بڑھیا نے منہ بنا کر چلاتے ہوئے کہا اور تیرا دل کا ہے کا ہے؟

"میرے دِل میں چھوڑا ہی کیا ہے آپ نے وہ تو پہلے ہی ٹوٹ پھوٹ کر بیکار ہو چکا ہے اور کسی وقت بھی اس کی کرچیں بکھر کر میرے سینے میں اندر تک پہونچ کر مجھے کلا ڈالیں گی۔ میں مٹی ہو جاؤں گی اب کسر ہی کونسی رہ گئی ہے۔" موہنی بھرائی ہوئی آواز میں کہتی رہی۔ "پھر آپ کا کیا بگڑ جائے گا آپ کے بیٹے کے لئے اور بہت، کہیں مالدار جگہ دیکھ لیجئے گا۔ لیکن یاد رکھئے جس گھر میں عورت کو دُکھی رکھا جاتا ہوا اور اس حد تک کہ اُس کی جان پر بن جائے وہ گھر کبھی سُکھ سے نہیں رہ سکتا کبھی پھل پھول نہیں سکتا۔ یہ لیجئے اپنا سامان اور دیکھ لیجئے کچھ رہ تو نہیں گیا۔" اُس نے ایک بکس اُس کی طرف تیزی سے سرکاتے ہوئے کہا۔ لیکن اس سے پہلے کہ بڑھیا غضبناک ہو کر کچھ جواب دیتی یا بہت ممکن تھا مارنے کے لئے لپکتی، اُس کا بھانجا اشوک اٹیچی ہاتھ میں لئے ہوئے دروازے سے آتا ہوا دکھائی دیا۔

"ارے اشوک تو؟" بڑھیا زبردستی چہرے پر مُسکراہٹ لا کر اسکی طرف لپکی اور پیار کرتے ہوئے بولی۔

"کتنے دن کے بعد تجھے دیکھا ہے میں نے۔"

"ہاں موسی چار دن کی چھٹی ابھی باقی تھی سوچا لاؤ موسی اور پرکاش سے بھی ملتا چلوں روز روز کہاں اتنی دور سے آنا ہوتا ہے۔ اب بھی سال بھر میں گھر کی صورت دیکھی ہے۔ سچ پوچھو موسی تو مدراس میں میرا جی نہیں لگتا ایک مہینے کی چھٹی لیکر آیا تھا۔ اتنے دن میں بھی نہ ماں کا دل بھرا اور نہ میرا اب بھی چلتے چلتے کہدیا ہے کہ کل تک ضرور واپس آجانا۔" پرکاش بھی نہ جانے کہاں سے نکل کر صحن میں آگیا اور اشوک سے مِل مِلا کر وہیں اپنی ماں اور اشوک کے پاس ہی بیٹھ گیا اور پھر ان لوگوں میں نہ جانے کہاں کی باتیں

شروع ہوگئیں۔ کچھ دیر بعد موہنی نے اپنے کمرہ کے دروازے سے باہر جھانکا اور آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی اُس کمرہ میں آگئی جہاں ستیش لیٹا ہوا تھا۔ وہ اُس کے اوپر جھک کر اُس کا ماتھا چھو کر دیکھ رہی تھی کہ اشوک نے اُسے دیکھ لیا۔

"ارے بھابی تم۔ کہاں چھپی بیٹھی تھیں ابتک۔ میں نے سوچا میکے گئی ہو" اشوک اُچک کر کھڑا ہو گیا اور تیز تیز قدموں سے اُس کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔

"سچ پوچھو بھابی تو تمہاری وجہ سے میں اور بھاگا آیا۔ شادی پر تو تم ہر وقت گٹھڑی سی بنی رہتی تھیں منہ دیکھنے میں بھی بڑی محنت کرنی پڑتی تھی۔ سوچا ابتو تم خوب بھاگی بھاگی پھرتی ہوں گی۔ اور آپ کون صاحب ہیں؟" اُس نے ستیش کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "کیا بیمار ہیں کچھ؟"

"جی میرے بھیّا ہیں بخار ہے ان کو" موہنی نے اُس کی طرف نظر اُٹھا کر کہا۔

"ارے یہ کیا بھابی تم رو رہی تھیں کیا؟ اور تمہاری آنکھوں میں اتنی گہری اُداسی آخر یہ سب کیا ہے۔ کیا بھیّا کی وجہ سے اتنی پریشان ہو۔ ٹھیک ہو جائیں گے کوئی دوا دی ان کو؟"

"جی دی تو ہے" موہنی نے وہیں ستیش کی پائنتی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"لیکن ایک بات ہے بھابی اشوک شرارت سے مسکرایا۔ اس اُجڑی اُجڑی حالت میں تم شادی کے دلوں سے بھی زیادہ سندر دِکھ رہی ہو" موہنی کے ہونٹ ذرا سے پھیل گئے جیسے مسکرا رہی ہو۔

ستیش بھی اُٹھ کر بیٹھ گیا تھا اور سوالیہ نظروں سے اشوک کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"اشوک اِدھر تو آ بیٹے" اُس کی موسی اسی کمرہ میں آگئی تھی "ارے چائے تو پی لے پہلے" وہ اُس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی اپنے کمرہ کی طرف لے گئی جو اِس کمرہ سے تھوڑے ہی فاصلہ پر تھا۔

موہنی آہستہ سے اُٹھی اور برابر والے کمرہ کے دروازے سے جو باہر کی طرف کھلتا تھا ذرا سا جھانک کر دیکھا۔ اور ایک بچے سے جو پاس ہی کھیل رہا تھا رکشا لانے کے لئے خوشامد کرنے لگی۔ اتفاق سے سامنے ہی سڑک پر خالی رکشا آتی ہوئی نظر آئی جسے اُس لڑکے نے وہیں سے اشارہ کرکے بلا لیا۔ جب رکشا آگئی تو وہ ستیش کے پاس آئی اور سہارا دے کر اُسے بٹھاتے ہوئے بولی چلو بھیا رکشا آگئی ہے۔ کچھ سامان تو میں نے بڑے والے بکس میں رکھ کر تالا لگا دیا ہے باقی سامان لگا ہوا ہے کمرہ میں۔ بس ایک اٹیچی بستر ایک بیگ اور کنڈی یہ سب ساتھ لے لیا ہے۔ تم بیمار ہو اور سامان جائے گا بھی کیسے پھر کبھی موقع ہوا تو لے جانا آکر۔

"ٹھیک ہے چلو چھوڑو۔" ستیش نے بڑے درد سے کہا۔ اتنی اتنی چیزوں کا کیا خیال کرنا ہے گھر ہی جب جلنے لگے تو اُس کے اندر کا بھی سب ہی کچھ جل جاتا ہے کچھ بھی نہیں بچتا۔" آہستہ سے بڑبڑاتا ہوا وہ اُٹھا اور ایک کراہ کے ساتھ جھک کر اٹیچی اُٹھائی اور رکشا میں لے جاکر رکھ دی اور پھر بستر اور بیگ دو چکروں میں لے ہی گیا۔ موہنی خاموش صحن کے ایک کونے بالکل تیار باسکٹ ہاتھ میں اُٹھائے کھڑی تھی اس کی چھلکتی ہوئی آنکھیں چاروں طرف نہ معلوم کیا دیکھ رہی تھیں کسے ڈھونڈھ رہی تھیں کہ اتنے میں چائے کی خالی ٹرے ہاتھ میں لئے ہوئے بملا آتی ہوئی نظر آئی اور موہنی کو اِس طرح کھڑا دیکھ کر ٹرے وہیں اسٹول پر رکھ کر نہ جانے کیسے آگے بڑھ آئی۔

"ہم جا رہے ہیں دیدی۔" اُسے سامنے دیکھ کر موہنی نے کہا۔ آپ ماں جی کو بلالیں وہ دیکھ لیں گی سامان وغیرہ میں سب یہیں چھوڑے جا رہی ہوں بھیا بیمار ہیں نا؟ بس ضروری سامان ہی ساتھ لیا ہے میں نے۔"

"ماں تو اشوک سے باتیں کر رہی ہیں شاید ہی آئیں"۔
"اچھا تو پھر میں چلوں رکشا والا جلدی کر رہا ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ بھی ستیش کے برابر میں جا کر بیٹھ گئی۔
بملا بھی دروازے تک آئی اور اُس کو بیٹھتے ہوئے دیکھنے لگی۔ پھر جیسے ہی رکشا حرکت میں آئی دونوں کی آنکھیں ملیں اور موہنی کے ہاتھ خود بخود ہی نمستے کے لئے اُٹھ گئے اور پھر اپنے آنسو چھپانے کے لئے اس نے اپنا سر نیچے جھکا لیا۔

اور پھر موہنی کے خیالوں نے پلٹا کھایا بالکل اسی طرح جیسے سینما کے پردے پر منظر بدل جاتا ہے اور اب جو یاد اُس کے ذہن کے پردہ پر اُبھری وہ بھی کچھ کم تکلیف دہ نہیں تھی سوائے تھوڑے سے حصّے کے جس میں کچھ ہلکے سے اطمینان کی گھڑیاں نہ جانے کہاں سے آ کر مل گئی تھیں۔ اُسے جھرجھری سی آ گئی۔

وہ اور ستیش رکشا میں بیٹھ کر گھر سے چلے۔ رکشا مخالف ہوا کو کاٹتی ہوئی جو اب تیز لو میں تبدیل ہو گئی تھی بڑی مشکل سے اسٹیشن کی طرف چلی موہنی بڑی مضبوطی سے ستیش کو پکڑے ہوئے تھی جو بخار کی حالت میں بار بار گردن ایک طرف کو ڈال دیتا تھا۔ بیس پچیس منٹ کی بجائے پون گھنٹہ میں رکشا اسٹیشن کے احاطہ میں داخل ہوئی بہت احتیاط سے اس نے پہلے ستیش کا ہاتھ پکڑ کر اُسے اُترنے میں مدد دی پھر قلی کو بُلا کر سامان اُس کے حوالے کیا۔ آگے آگے قلی اور پیچھے ڈگمگاتے لڑکھڑاتے ستیش کو پکڑے ہوئے موہنی پلیٹ فارم پر پہونچی۔ ایک بینچ پر نظر پڑتے ہی ستیش اُس پر بیٹھ گیا۔ موہنی نے بہت چاہا کہ اُس کو ویٹنگ روم تک لے جائے لیکن اُس نے ہاتھ کے اشارے سے اُس کو منع کر دیا اور وہیں بینچ پر وہ لیٹ گیا موہنی بھی وہیں اُس کے پیروں کے پاس بیٹھ گئی۔ موہنی دیکھ رہی تھی کہ ستیش بار بار اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا اُسے خود بھی کافی پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ کنڈی میں سے گلاس نکال کر پانی لانے کے

خیال سے بڑے تذبذب کے عالم میں بینچ سے وہ اُٹھی اور اِدھر اُدھر دیکھ کر جیسے اُس نے ایک طرف کو قدم بڑھانا چاہا۔ دیدی دیدی کہتا ہوا ایک نوجوان اُس سے آکر لپٹ گیا اور جب گھبرا کر اُس نے غور سے اُس کی طرف دیکھا تو فوراً ہی اُس کو اپنی سخت قسم کی غلطی کا احساس ہوا اور وہ ہڑبڑا کر اُس سے الگ ہو گیا۔ ستیش نے بھی لیٹے لیٹے یہ سب دیکھ لیا تھا اور سر اٹھا کر بڑی حیران نظروں سے وہ اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

شرمندگی اور ندامت سے اُس نوجوان کو پسینہ آگیا لیکن پھر ہمت کر کے اٹک اٹک کر اُس نے ساری بات اُن لوگوں کو بتا ہی دی۔

معاف کیجئے گا بھائی صاحب ستیش کی طرف دیکھتے ہوئے وہ بولا میں سخت شرمندہ ہوں وہ بات ایسی ہے کہ ابھی کچھ دن پہلے ہی میری بہن کا انتقال ہو گیا ہے اور یہ بالکل اُن جیسی ہی ہیں۔ بہت معمولی سا فرق ہے جو پہلی نظر میں معلوم ہی نہیں ہو سکتا۔ وہ میری ایک ہی بہن تھی بھائی صاحب آپ خود سوچ سکتے ہیں کہ اس صدمے سے ہم سب کی کیا حالت ہو گی ابھی تک ہمارے ہوش و حواس قابو میں نہیں آئے ہیں مجھے اِس وقت نہ جانے کیا ہو گیا تھا مجھے خود حیرت ہیں ہے۔

ستیش تو تھوڑی بہت بات سُن کر خاموش لیٹ گیا لیکن موہنی نے بڑے غور سے اُس کی بات سُنی اور آنسو اُس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ ایک چھوٹی سی بچی جو مشکل سے دو ڈھائی سال کی ہو گی کچھ دیر تو موہنی کو کھڑی دیکھتی رہی پھر بے ساختہ آگے بڑھ کر اُس کے گلے میں اپنے ننھے منّے بازو حمائل کرتے ہوئے اپنی توتلی زبان میں اُس لڑکے کی طرف دیکھ کر بولی۔

ماما آپ جھوٹ بہت بولتے ہیں۔ ممّی بہت دور کہاں گئی تھیں۔ وہ تو یہ آگئیں دیکھو اتنے عجیب انداز سے اُس نے یہ بات کہی کہ موہنی اُس کو پیار کئے بغیر نہ رہ سکی اِن دونوں کو اِس طرح ایک دوسرے کو پیار کرتے

دیکھ کر اُس لڑکے کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ کچھ دیر اسی طرح بیٹھے رہنے کے بعد اُس کو کچھ خیال آیا اور پھر گلاس کو دیکھتے ہوئے جواب بھی موہنی کے ہاتھ میں تھما ہوا تھا وہ بڑے خلوص سے اُس کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔

"آپ پانی لینے جا رہی تھیں شاید؟"

"ہاں بھیّا کو بخار ہے نا۔ یہ بار بار ہونٹوں پر زبان پھیر رہے تھے میں نے سوچا اُن کو پانی لا کر پلا دوں۔" اُس نے ستیش کے ماتھے کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

اُس لڑکے نے بھی جھک کر اُس کا ماتھا چھُوا اور گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔

"ارے اِن کو تو تیز بخار ہے اور آپ اتنی گرمی میں اِن کو اسی حالت میں لیکر گھر سے نکل پڑیں۔ اچھا ٹھہریئے میں پہلے پانی لے آؤں کوئی لوٹا ہے آپ کے پاس یہ گلاس تو بہت چھوٹا سا ہے اس میں کتنا پانی آئے گا۔"

"لوٹا؟" موہنی نے کنڈی میں ہاتھ ڈال کر لوٹا ڈھونڈھنا چاہا۔

"چھوڑیئے میں لاتا ہوں ابھی۔" اور وہ ویٹنگ روم کی طرف جھپٹا چلا گیا کوئی پانچ منٹ بعد ہی وہ ٹھنڈے پانی سے بھرا ہوا لوٹا لیکر آ گیا۔ موہنی نے جلدی سے پانی گلاس میں بھر کر پہلے ستیش کو پلانا چاہا لیکن اس وقت وہ کچھ زیادہ ہی غفلت میں ہو گیا تھا اس لئے اُس لڑکے نے آگے بڑھ کر اپنے سہارے تھوڑا سا اُسے بٹھایا اور ذرا ہوشیار کر کے گلاس اُسکے منہ سے لگا دیا۔ پانی پی کر اُسے کچھ تسکین ہوئی اور لیٹنے کی بجائے وہ پیچھے بستر کی ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ جو اُس لڑکے نے اُٹھا کر اُس کے پیچھے رکھ دیا تھا اور غور سے اُسے دیکھنے لگا جو اُس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر پاس بیٹھ گیا تھا اور پھر فوراً ہی لڑکے کو کچھ خیال آیا اور اُس نے اپنا ہاتھ کاندھے سے اُٹھا کر اُس کی کمر میں ڈال دیا اور کھڑا کرتے ہوئے بولا۔

"چلئے اُدھر ویٹنگ روم میں چلئے یہاں بہت گرم ہوا آرہی ہے۔ وہاں میری ماں ہیں اور میرے بہنوئی بھی جو ڈاکٹر ہیں اور دواؤں کا پورا بیگ اُن کے ساتھ ہے۔ آپ ابھی ٹھیک ہو جائیں گے فکر نہ کیجئے اور سنئے آپ لوگ جا کہاں رہے ہیں ؟"

"ہمیں سہارنپور جانا ہے بھیّا۔" پیچھے سے موہنی کی آواز آئی۔

"ارے پھر تو کافی دیر تک ساتھ رہے گا ہم لوگ رڑکی اُتریں گے ابتو کوئی پریشانی کی بات نہیں۔ گاڑی آنے میں بھی ابھی کافی وقت باقی ہے۔"

وہ نوجوان ستیش کو پکڑے ہوئے ابھی تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ ایک انتہائی شاندار اور پُروقار سا آدمی آہستہ آہستہ چلتا ہوا اُس کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ موہنی نے اُس کو دیکھتے ہی اپنا آنچل درست کیا اور اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ لڑکا ستیش کو لئے ہوئے جب اور آگے بڑھ گیا تو اچانک ہی اُس آدمی نے گھوم کر پیچھے موہنی کی طرف دیکھا اور بس دیکھتا ہی رہ گیا۔

اُفوہ اتنی گہری مشابہت اُس نے سوچا۔ اویناش ٹھیک ہی کہہ رہا تھا لیکن نہیں تھوڑا سا فرق ہے آنکھوں میں اور قد میں بھی اور یہ کہ اسکے چہرے کی معصومیت اور گہری اُداسی بھی اُس کملیش سے تھوڑا الگ کئے ہوئے ہے پھر کتنا ٹھہراؤ سا ہے اس کی شخصیت میں لگتا ہے دُکھوں کی دھوپ نے اُس کو بُری طرح تپا کر رکھ دیا ہے اور پھر بڑی شائستگی سے وہ بولا۔

"ویٹنگ روم میں چلنے پر آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ؟"

"جی نہیں تو۔" اچانک ہی چونک کر موہنی نے سر اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھا اُس سے دو قدم کے فاصلے پر ہی وہ وجیہہ اور باوقار شخص کھڑا تھا۔ عمر کوئی ۳۶۔۳۷ کے لگ بھگ ہو گی انتہائی خوبصورت اور بارعب چہرے پر باریک ترشی ہوئی مونچھیں تھیں۔ آنکھوں میں حد درجہ خلوص نیکی اور شرافت کی جھلک تھی جو لاکھوں انسانوں میں اُسکو ممتاز کرتی تھی۔ اور اس وقت

ہونٹوں پر بڑی ہی مدھم اور سوگوار سی مُسکراہٹ لئے ہوئے نہ جانے کس سوچ میں گُم وہ اُس کو بس دیکھے ہی جا رہا تھا۔ اور وہ گھبرا کر اور کچھ مرعوب ہو کر سمٹتی جا رہی تھی اپنے آپ میں اور نظریں پلیٹ فارم کے چکنے فرش پر جیسے گڑ کر رہ گئی تھیں۔

دو منٹ بعد کسی کے قدموں کی آہٹ ہوئی اور قریب سے ہی ایک خوبصورت مردانہ آواز اُبھری۔

آ گئے ادیناش اُن کو آرام سے لٹا دیا ہے نا؟ اچھا اب ان کو بھی لے چلو اور سامان کے لئے قلی کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔

ارے چھوڑئے قلی وُلی کو ادیناش نے خود ہی ہولڈال اُٹھاتے ہوئے کہا اور دوسرے ہاتھ میں بیگ بھی اُٹھا لیا۔ اٹیچی کو اُس آدمی نے اُٹھا کر اپنے ہاتھ میں لے لیا اور کنڈی موہنی تو دہی اُٹھا کر کھڑی ہو گئی تھی۔

"لائیے کنڈی بھی ادھر دیدیجئے"۔ اُس نے موہنی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"جی نہیں اس کو میں ہی لئے چلتی ہوں"۔ اُس نے اپنا ہاتھ پیچھے کر لیا آگے آگے وہ دونوں اور پیچھے موہنی ویٹنگ روم میں داخل ہوئی۔ ایک بزرگ خاتون خاندانی شرافت وجاہت اور عظمت جن کے چہرے سے نمایاں تھی سفید براق ساڑی پہنے ہوئے سٹیشن کے پاس ہی کھڑی ہوئی تھیں جو بڑے آرام سے ایک زرد سِلک کی چادر اوڑھے ہوئے لیٹا تھا۔ موہنی کو دیکھ کر وہ آگے بڑھیں اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کر ذرا سا جُھک کر اُسے اپنے سینے سے لگاتے ہوئے بڑی رقت آمیز آواز میں بولیں۔

ارے یہ تو میری کملیش ہی بھگوان نے مجھے لوٹا دی اور کافی دیر تک دونوں ایک دوسرے میں سمائی ہوئی روتی رہیں۔ دونوں کے دل دُکھی تھے لیکن دُکھ کا انداز جدا گانا تھا۔ ادیناش بھی ایک طرف کھڑا آنسو بہاتا رہا پھر دونوں کو الگ کرتے ہوئے بولا۔

"ہاں۔ وہ خود ہی پریشان ہو رہی ہیں۔ تم اور رلا رلا کر آدھا کئے دے رہی ہو۔"

اور اُس نے دونوں کو لا کر پنکھے کے نیچے بٹھا دیا۔ چند منٹ کے بعد وہ بزرگ عورت جو اوینا شں کی ماں تھیں مُڑ کر اپنے داماد سے مخاطب ہوئیں۔

"سریندر بیٹا کوئی دوا دی ان کو؟"

"ہاں ماں جی ابھی انجکشن دیتا ہوں۔ آدھا گھنٹہ بھی نہیں لگے گا اور بخار ہوا ہو جائے گا اِن کا۔"

اور واقعی انجکشن لگنے کے پندرہ منٹ بعد ہی ستیش کو پسینہ آنا شروع ہو گیا اور اتنا آیا کہ اُس کے کپڑے بُری طرح بھیگ گئے۔ ڈاکٹر کرسی سے اُٹھا اور چادر ہٹا کر دیکھتے ہوئے اوینا شں سے تولیہ نکالنے کو کہا۔ اور جب اوینا شں تولیہ سے اُس کا پسینہ صاف کر رہا تھا ستیش نے آنکھیں کھول دیں اور چاروں طرف دیکھتے ہوئے اُٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔

ابھی اُٹھئے نہیں پسینہ صاف کرنے دیجئے اچھی طرح پھر یہ بھیگے ہوئے کپڑے اُتار ڈالئے گاڑی آنے میں اب تھوڑی ہی دیر رہ گئی ہے۔ ڈاکٹر نے بڑی نرمی اور محبّت سے کہا۔

موہنی نے جلدی سے بیگ کھول کر ایک کُرتا اور پاجامہ نکال کر اُسکے پاس لا کر رکھا اور اوینا شں نے بڑی پھُرتی سے اُس کو کپڑے بدلوائے اور تھرموس سے ایک کپ گرم گرم چائے بھی نکال کر اُس کو پلا دی۔ ستیش اب کافی ہلکا پن محسوس کر رہا تھا اور پوری طرح ہوش میں تھا۔ اوینا شں کی طرف دیکھتے ہوئے نہائت شکر گذاری اور احسان مندی کے انداز میں اُس نے کہا۔

"آپ نے مجھے کوئی انجکشن دیا تھا اور بخار اُتر گیا۔ اب میں بالکل ٹھیک ہوں آپ کا شکریہ میں کس طرح ادا کروں۔"

"ارے نہیں" اوینا ش نے بڑھ کر اُس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"میں شکریہ وگریہ کے قابل نہیں ہوں جناب۔ میں تو بہت چھوٹا سا آدمی ہوں اور اِس میں شکریہ کی بات بھی کونسی ہے اور اگر پھر بھی آپ یہ رسم ادا کرنا ہی چاہتے ہیں تو اس کا حقدار میں نہیں۔ میرے بھائی صاحب یعنی میرے بہنوئی ہیں۔ وہ دیکھئے پیچھے کی طرف۔ کیسی معصوم صورت بنائے کھڑے ہیں۔ مسٹر سریندر کمار بھارگو۔ ایم۔ بی۔ بی۔ ایس میڈیکل آفیسر رُڑکی......"

"اب چپ بھی ہوگے یا نہیں ڈاکٹر نے ہاتھ اُٹھا کر اُس کو روکا اور ٹہلتا ہوا ستیش کے سامنے ہی آکر بیٹھ گیا۔

"نہیں مسٹر۔ آ"

"جی مجھے ستیش کہتے ہیں" ستیش کو اپنا نام بتانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

"تو مسٹر ستیش۔ آپ ایسا ہرگز نہ سوچیں۔ ہم نے جو کچھ بھی تھوڑا بہت کیا یہ آپ کے اوپر احسان نہیں ہے۔ یہ تو ہمارا فرض تھا اور ویسے بھی اوینا ش نے تو آپ لوگوں سے رشتہ جوڑ ہی لیا ہے اور ماں جی نے بھی اِس طرح آپ ہمارے بھائی ہی ہوئے نا؟"

"ہاں بھئی مجھے تو میری کھوئی ہوئی لمّو ہی مل گئی" انہوں نے پھر اُسکا سر اپنے سینے سے لگالیا۔

"ارے ارے ماں جی پھر وہی۔ ذرا اس کا خیال رکھنا گاڑی بس آنے ہی والی ہے کبھی آپ دونوں کا رونا پھر شروع ہو جائے" اوینا ش نے شرارت سے کہا۔

"نہیں نہیں" انہوں نے فوراً ہی اُس کو چھوڑ دیا اور دو ایک آنسو جو واقعی پھر اُن کی آنکھوں میں آگئے تھے آنچل سے صاف کرتی ہوئی بولیں۔

"تو پھر اُٹھو نا تم لوگ مُنّی کو دیکھو اتنے اطمینان سے کیوں بیٹھے ہو اور بیٹی

وہ موہنی سے مخاطب ہوئیں۔ تم نے بھائی کے اُترے ہوئے کپڑے نہیں رکھے۔ لاؤ اچھا میں ہی رکھے دیتی ہوں بیگ میں۔"

"نہیں ماں جی میں رکھ دوں گی۔"

"اور تمہارا نام تو مجھے ابھی تک معلوم ہی نہیں ہوا۔"

"جی میرا نام موہنی ہے۔"

"اچھا۔ بڑا سُندر نام ہے۔ جیسی خود ویسا ہی نام بھی ہے۔"

اویناش وہ تولیہ اور چادر تو اِدھر دو۔"

"نہیں چادر تو ستیش بھیا لپیٹ کر نکلیں گے باہر ہوا بہت گرم ہے۔"

"ارے بھئی اب تو میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ماں جی آپ رکھ دیجئے اُس کو۔" ستیش بولا۔

کچھ منٹ بعد جب گاڑی آ گئی تو ستیش نے جیب سے اپنا منی پرس نکالتے ہوئے بڑی لجاجت سے کہا۔

"دو ٹکٹ ہمارے سہارنپور کے لئے لیں۔ اور کچھ نوٹ اُس کی طرف بڑھائے۔

"دیکھئے بھائی صاحب۔" اویناش نے افسردہ سا چہرہ بنا کر کہا۔

"بہت دل توڑنے والی بات کر رہے ہیں آپ۔ جب نہیں ہوں گے تو آپ سے ضرور لے لوں گا اور سنئے آپ دونوں کے ٹکٹ میں رُڑکی کے لئے ہی لوں گا۔ کچھ دن ہمارے ساتھ ٹھہر کر آپ سہارنپور چلے جائیں۔ ابھی آپ پوری طرح ٹھیک نہیں ہوئے ہیں اور ہمارے بھائی صاحب کا ہاتھ ہے کمال ہے صاحب بس یہ سمجھئے کہ مرض ان کی صورت دیکھتے ہی ایسا بھاگتا ہے کہ پلٹ کر دیکھتا بھی نہیں۔ اس کے لئے دور دور تک ان کی شہرت ہے آپ کسی سے بھی پوچھ لیجئے۔"

"وہ تو سب ٹھیک ہے بھیا لیکن ایک مجبوری ایسی ہے کہ ہمارا جلدی

سے جلدی گھر پہونچنا بہت ضروری ہے۔ ہماری ماں کی طبیعت خراب ہے میں اس کو اسی لئے لینے آیا تھا لیکن یہاں آکر خود ہی بیمار پڑ گیا اور ایک ہفتہ اسی چکر میں نکل گیا۔ آپ لوگ خود ہی سوچ سکتے ہیں کہ ماں کا کیا حال ہو گا جبکہ کوئی چٹھی بھی نہیں جا سکی۔ آج کل پر ہی معاملہ ٹلتا رہا۔"

"اچھا؟ ایسا ہے تو میں مجبور نہیں کروں گا" بہت رُک رُک کر اونباش نے کہا۔

"لیکن وعدہ کیجئے کہ آپ اور دیدی ان کے ٹھیک ہوتے ہی رُڑکی ضرور آئیں گے۔"

"اچھا وعدہ رہا ستیش نے ہنس کر کہا۔" اونباش ٹکٹ لینے چلا گیا اور پھر وہ سب اکٹھے ہی فرسٹ کلاس کے ایک ڈبہ میں سوار ہو گئے ان لوگوں کے علاوہ وہاں اور کوئی نہیں تھا کچھ دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ سب ہی بول رہے تھے سوائے موہنی کے جو سر جھکائے نہ معلوم کن خیالوں میں گم تھی۔ جب گاڑی چل پڑی تو اونباش کی ماں سرسوتی دیوی جو موہنی کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھیں ستیش کی طرف مڑ کر بولیں۔

"میں نے جب سے اس کو دیکھا ہے برابر یہی سوچ رہی ہوں کہ یہ اتنی اُداس کیوں ہے۔ لڑکیاں اس عمر میں اتنی خاموش اور کھوئی کھوئی کہاں رہتی ہیں۔ اِس کا پتی کیسا ہے اور سسرال میں یہ سُکھی تو ہے نا؟"

"ارے ماں جی" ستیش نے ایک لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔" یہ کہانی لمبی ہے کیا کیجئے گا سُنکر۔ آپ کو بھی دُکھ ہی ہو گا۔"

"ہوں۔ یہی میں اتنی دیر سے دیکھ رہی ہوں کہ بچی کُمھلائی کُمھلائی سی ہے اس کے من میں ضرور کوئی دُبدھا ہے۔ آخر کچھ تو بتاؤ بیٹا۔"

اور پھر ستیش نے پوری بات ان لوگوں کو سنا دی اور سر کو پیچھے ٹیک کر خاموش بیٹھ گیا۔ کافی دیر تک سب چپ بیٹھے رہے کوئی کچھ نہ

بولا سب ہی دُکھی ہو گئے تھے لیکن اویناش کے چہرہ پر دُکھ کے ساتھ ساتھ غصہ کی پرچھائیاں بھی گہری ہوتی جا رہی تھیں۔ اُس نے سر اُٹھایا تو جوش سے اُسکا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

"اور آپ نے سب کچھ سُن لیا اور خاموش رہے۔ اُس نے کانپتی ہوئی آواز سے ستیش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ میں آپ کی جگہ ہوتا تو ایک آدھ کے ایسا ہاتھ دیتا کہ چھٹی کا دودھ یاد آجاتا۔ ایسے کمینوں کا یہی علاج ہے اور ایسے پاگل شوہروں کے تو سیدھے سیدھے گولی مار دے پیچھے کچھ بھی ہوتا رہے۔"

"کیوں بیوقوفی کی بات کرتے ہو یار یہ بچہ پن کبھی چھوڑ دگے بھی۔ اتنے لمبے تو ہو گئے ہو۔" ڈاکٹر نے ہاتھ سے اُسکو روکتے ہوئے کہا۔

"بس اس کو یہی آتا ہے عقل ہو پاس تو ڈھنگ کی بات بھی کرے۔" اس کی ماں بھی اس کو گھورتی ہوئی بولیں۔

"ہوں۔" اویناش غصہ سے بڑبڑایا۔ "بس عقل تمیز اور شرافت کو لئے بیٹھے ہو کسی کی جان چلی جائے چاہے۔"

"بس آدمی آدمی کی بات ہے بھیا۔"

"ہماری کملیش کی شادی ہوئی تھی تو اِن کے سورگیہ پتا جی نے کچھ بھی لینے سے انکار کر دیا تھا۔" سرسوتی دیوی سریندر کی طرف اشارہ کرتی ہوئی بولیں۔

"میرے بھیا کے کاروبار میں اُن دِنوں گھاٹا آگیا تھا وہ پریشان تھے اِن کے پتا جی کو جب خبر ہوئی تو خود ہی چلے آئے اور بار بار کہتے تھے بھائی صاحب آپ بالکل چنتا نہ کریں۔ ہمیں جہیز اور پیسے کا بالکل لالچ نہیں ہے ہمارے پاس بہت پیسہ ہے اور لڑکا پڑھا لکھا ہے ڈاکٹر ہے وہ خود ہی لاکھوں کمالے گا جہیز یا پیسہ تمام عمر تو چلتا نہیں۔ آدمی میں دم ہو تو وہ ہزاروں کما کر دوسروں پر بھی لگا دے گا۔ آپ معمولی سامان دے دیں اگر آپ کی یہی خوشی ہے تو اور

نہ ہو سکے تو بالکل بھی نہ دیں لڑکی تو تمام زندگی ہی لیتی رہتی ہے۔ جب ہوگا آپکے پاس تو دیکھا جائے گا آپ اپنی خوشی کسی وقت بھی پوری کر سکتے ہیں اور پھر ایک لمبی سانس لیتی ہوئی وہ بولیں۔"

"بڑے دیوتا سمان تھے ہمارے سمدھی ایسے آدمی تو مشکل ہی سے ملتے ہیں اور اتنے پر بھی جب تک جئے آنکھوں پر ہی اُتارتے رہے بہو کو۔ سمدھن تو ہماری تھیں ہی نہیں۔ چھوٹا سا چھوڑ کر ان کو مر گئی تھیں۔"

یہ بات آج تک سمجھ میں نہیں آئی۔ سب سے آخیر میں ڈاکٹر بھی بہت گمبھیر لہجہ میں بولا جو اب تک خاموشی سے بیٹھا سب کی باتیں سُن رہا تھا کہ ہمارے دیش نے اتنی ترقی کر لی ہے اور تہذیب بھی ہر طرف بکھری نظر آتی ہے جس پر ہم کو بڑا فخر بھی ہے لیکن کچھ دماغ آج بھی اسقدر زنگ کھائے ہوئے ہیں کہ کسی بھی نئی بات کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے پرانے بزرگ تو ہیں ہی جیسے ہیں۔ یہ نئی نسل بھی کچھ سوچنے سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتی۔ خصوصاً عورت کے معاملے میں تو ہم جوں کے توں وہیں ہیں جہاں اب سے ہزاروں سال پہلے تھے۔ ڈھنڈورا چاہے ہم کتنا ہی پیٹتے پھریں اُسکی آزادی اور اُس کے حقوق کے بارے میں اور اکثر اُس کو اِسی طرح کمتر سمجھ کر نظر انداز کیا جاتا ہے اور وہ انتہائی مجبور اور بے بس نظر آتی ہے اور مزے کی بات یہ کہ وہ غریب خود بھی دھوکہ کھاتی ہے کہ اُس میں اور پہلے وقت کی عورت میں بڑا فرق ہے یعنی وہ اُس زمانے کی عورت سے بہت بہتر ہے۔ کبھی کبھی تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے ہم کسی ایسے پچھڑے ہوئے دیش میں پہنچ گئے ہیں جہاں عورت اب بھی جانور سے بدتر زندگی گذارتی ہے اور سخت قسم کی بیہودہ اور تکلیف دہ رسم و رواج کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے۔"

"ارے او ویناش۔" یکایک ڈاکٹر نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

"کوئی اسٹیشن آرہا ہے دیکھنا کچھ ٹھنڈا پینے کو مل جائے تو۔ بڑی گرمی ہے۔"

"ہوں۔ اسٹیشن تو چھوٹا سا ہی ہے خیر دیکھتا ہوں۔" اویناش نے بیٹھے بیٹھے باہر جھانکتے ہوئے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر بعد ایک چھوٹا سا لڑکا اویناش کے ساتھ ہاتھ میں لیمو کے پانی کا جگ اور کچھ گلاس لیکر آ گیا۔ ڈاکٹر نے سب کو ایک ایک گلاس بھر کر پکڑا دیا۔ آخیر میں ذرا آگے بڑھکر موہنی کی طرف بھی ایک گلاس بڑھایا جو اب بھی سر جھکائے گُم سُم بیٹھی تھی۔

"لیجئے۔" بڑی ہی نرم اور میٹھی آواز سے اُس نے کہا۔

موہنی نے چونک کر سر اُٹھایا۔ اچانک ہی دونوں کی نگاہیں ٹکرائیں اور وہ ہڑبڑا کر رہ گئی۔ فوراً ہی نظریں جھکاتے ہوئے اُس نے کہا۔

"جی۔ میں۔ آپ لوگ لیجئے پہلے، میں بھی پی لوں گی۔ مجھے پیاس نہیں ہے۔"

"پی لیجئے بے پیاس کے ہی۔ گرمی زیادہ ہے اِسوقت۔"

"اور پھر بے ارادہ ہی اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد موہنی کی نگاہیں پھر اُٹھیں اور اُن آنکھوں سے جا ملیں جن میں خلوص تھا اپنائیت بھی اور التجا بھی۔ موہنی کا ہاتھ خود بخود گلاس کی طرف بڑھ گیا اور جب وہ چھوٹا سا گلاس خالی ہوا تو ایک ہاتھ جگ لئے ہوئے پھر بڑھا گلاس کی طرف۔

"بس اب نہیں۔" گلاس پیچھے ہٹاتے ہوئے اُس کے منہ سے نکلا۔

"بس ایک اور ہمارے کہنے سے۔"

اور سحر زدہ سی وہ دوسرا گلاس بھی پی گئی۔

اور پھر اِس کڑی کا ایک اور آخری اور بڑا ہی دل گداز منظر اُسکے خیالوں میں آیا۔ وہ تھا اِن پیارے اور مہربان ہم سفروں سے رُخصت ہونے کا منظر۔ اُن کی منزل آ چکی تھی گاڑی کی رفتار میں کمی آ رہی تھی سامان

تیار تھا۔ سب سے پہلے اویناش کی ماں اُٹھیں اور ستیش کے پاس آکر اُسکے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔

"چھٹی برابر لکھتے رہنا بیٹا ستیش اور تمہاری ماں ٹھیک ہو جائے تو موہنی کو لیکر ضرور آنا ہمارے پاس۔ کبھی گھر جاکر بھول جاؤ ہم لوگوں کو۔"

"ارے نہیں ماں جی۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے" وہ بھی کھڑا ہو گیا۔

"اور سنو پتہ تو تمہارا اویناش نے لے لیا ہے نا؟"

"جی۔ اور اپنے بھی دو پتے لکھا دیئے ہیں۔"

"بس ٹھیک ہے۔ اور وہ موہنی کی طرف مڑ گئیں جو ان کے پاس ہی آکر کھڑی ہو گئی تھی اور اپنی بھیگی بھیگی آنکھوں سے اُنہیں دیکھ رہی تھی وہ اُس کو اپنے سے لپٹاتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں بولیں۔

"اچھا بیٹی اب ہم چلتے ہیں۔ من تو نہیں کر رہا تجھکو اسوقت چھوڑنے کے لئے لیکن مجبوری ہی ایسی ہے کیا کریں۔ جاتے ہی اپنی ماں کی خیر خبر لکھ بھیجنا بھولنا نہیں۔ بھگوان تجھے جیتا رکھیں اور تو سدا سکھی رہے۔"

اور اِس بات میں نہ جانے کیا تھا کہ موہنی کی سسکیاں ایکدم ہی تیز ہو گئیں اُس نے زور سے کہنا چاہا "نہیں ماں مجھے جینے کی دعا نہ دو اس طرح جی کر میں کیا کروں گی لیکن وہ کہہ نہ سکی۔ اُس کے بعد اویناش بھی پیچھے سے آکر اُس کے گلے میں ہاتھ ڈالتے ہوئے سسک پڑا۔

ڈاکٹر جو سب سامان نیچے اتروا کر ستیش سے مصافحہ اور رسمی الوداعی بات چیت کے بعد ان لوگوں کے نیچے آنے کا انتظار کر رہا تھا پھر بڑھا کمپارٹمنٹ کی طرف اور اندر جاکر اویناش کو دونوں کندھوں سے پکڑ کر الگ کرتے ہوئے بولا۔

"حد ہو گئی اویناش تم تو عورتوں سے بدتر ہو ذرا سی بات پر رو دیتے ہو اور ان کو بھی رُلا رہے ہو بیکار۔ فاصلہ ہی کتنا ہے جب چاہو مل لو

جاکر یا لے آؤں ان کو گھر" اور نیچے اُتر کر سب وہیں کھڑے اُن دونوں سے باتیں کرتے رہے۔ ننھی پنکی جو ابتک سوتی چلی آئی تھی اب جاگ کر چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی۔ موہنی پر نظر پڑتے ہی وہ دونوں ہاتھ اُس کی طرف بڑھا کر ممی۔ ممی چلاتی ہوئی باپ کی گود میں مچل پڑی۔ ڈاکٹر گھبرا گیا اور کندھے سے لگا کر اُس کو بہلانے کی ناکام کوشش کرنے لگا اور جب بچی نے رونا شروع کر دیا تو موہنی نے بھی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے اُس کو دیکھا اور وہیں اندر سے دونوں ہاتھ بڑھا کر گود میں لے لیا اور پیار کرنے لگی اور جب گاڑی نے سیٹی دی تو موہنی نے گھبرا کر اس کو ڈاکٹر کی طرف بڑھا دیا اور جس وقت ڈاکٹر واپس بچی کو لے رہا تھا پھر دونوں کی نگاہیں چار ہو گئیں۔

اُف اتنی گہری اداسی کے سائے اچانک کہاں سے آکر پھیل گئے۔ اُس کی آنکھوں میں یہ تو بڑے صبر اور ضبط کا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ موہنی نے حیرت سے سوچا اور اندر ہی اندر وہ بھی اداس ہو گئی لیکن اُس نے جلد ہی خود کو سنبھال لیا۔ یہ سب کیا ہے مجھے یہ کیا ہوتا جا رہا ہے تقدیر مجھے اب اور کیا دکھانا چاہتی ہے وہ بہت پریشان ہو گئی۔ گاڑی اب رینگنے لگی تھی اور جب تک وہ لوگ نظر آتے رہے وہ ڈاکٹر سے اپنی نظریں چُراتی رہی۔

اب یادوں کی کڑیاں ٹوٹنے لگی تھیں تصوّر میں کچھ باقی نہ رہا تھا اور اُس کے ذہن کا پردہ اب بالکل صاف تھا لکشمی باہر کسی سے زور سے مخاطب ہوئی تھی اور وہ یکایک چونک پڑی تھی۔ اُس نے جھٹکے سے کروٹ بدلی سامنے کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ صحن میں کہیں سے اویناش لکشمی اور اُس کے بابوجی کے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں اُس نے دل میں پکّا ارادہ کر لیا تھا کہ وہ اویناش کے ساتھ ڈاکٹر کے یہاں ہرگز نہیں جائے گی اگر وہ

اپنے گھر لے جاتا اور ڈاکٹر وہاں نہ ہوتا تو کوئی بات نہ تھی۔ وہاں تو بار بار اُس کا سامنا اُس سے ہو گا۔ ویسے وہ بہت شریف آدمی ہے بُردبار ہے بہت ہی نیک اور سچّا انسان ہے لیکن وہ اپنی بیوی کو بہت چاہتا تھا اور میری صورت اُس سے ملتی ہے دوسرے میرے دُکھوں سے وہ بہت متاثر ہے اس لئے میرے بھلے کے لئے ہی کیا۔ اُس کا میری طرف جُھکنا ایک فطری امر ہے اور یہاں میری حالت یہ ہے کہ مجھ میں اب رہا ہی کیا ہے جو میں اُسے دے سکوں گی۔ میری امنگیں میرے ارمان اور آرزوئیں سب ہی کچھ تو ختم ہو چکا ہے۔ اور جو بچا ہے وہ ہے میرا خالی خولی وجود۔ میں تو ایک لاش طرح ہوں جو چلتی پھرتی اور بولتی ہے سب ہی کچھ کرتی ہے لیکن روح کی اُس میں نہیں ہے یا پھر راکھ کا ایک ڈھیر جس میں بہت تلاش کے بعد بھی ایک ننھی سی چنگاری تک کسی کے ہاتھ نہ آسکے اس کے علاوہ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ پرکاش کو میں کس طرح بھول سکوں گی ہمارے دیش کی عورت ایک بار جب کسی ہو جاتی ہے تو پورا پیار بس اُس ایک ہی مرد پر نچھاور کر دیتی ہے۔ وہ لاکھ نردئی لاکھ بے درد سہی لیکن اُس کا ہیولہ برابر میرا پیچھا کرتا رہے گا۔ میرا من کہتا ہے کہ اب وہ ضرور پچھتا تا ہو گا اُس کو میری یاد ضرور آتی ہو گی بھگوان کو کچھ بھی کرتے دیر نہیں لگتی کون جانے وہ سب کو چھوڑ چھاڑ کر پلٹ ہی آئے۔ پھر اچانک ہی ننھّی منّی پنکی کا معصوم چہرہ اُس کی نظر کے سامنے آگیا۔ اور وہ کانپ گئی۔ اُف وہ ننھّا سا معصوم وجود جس کی ماں اُس سے چھین لی گئی ہے اگر مجھ سے زیادہ ہی گھُل مِل گیا تو پھر مجھے اور بھی مجبور ہونا پڑے گا۔ اِس سے پہلے کہ حالات آگے بڑھ جائیں مجھے اس قصہ کو یہیں ختم کر دینا چاہیئے۔ ورنہ بہت بُرا ہو گا۔ میری آتما مجھے کسی طرح چین نہیں لینے دے گی۔ ڈاکٹر کے لئے لڑکیوں کی کمی نہیں اُس کو تو اچھّی سے اچھّی لڑکی مِل جائے گی بس یہی بہتر ہے کہ میں وہاں نہ جاؤں۔

میں اوینا ش سے کوئی نہ کوئی بہانہ بنا دوں گی۔ شروع میں وہ شور ضرور مچائیگا پھر خاموش ہو کر چلا جائے۔ یہی سب سوچتی ہوئی وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی اور آہستہ سے لکشمی کو پکارا آواز سنتے ہی اوینا ش کمرہ میں داخل ہوا۔

"ارے دیدی کتنی بار آکر جھانک چکا ہوں مگر تمہاری نیند ہے کہ ٹوٹتی ہی نہیں۔"

"نہیں تو۔ میں تو جاگ رہی تھی تم نے آواز دے لی ہوتی۔"

"کیا مطلب؟"

"بس سو بھی رہی تھی اور جاگ بھی رہی تھی۔"

"ارے تو کیا جاگتے میں بھی سپنے دیکھتی ہو تم بالکل چُپ چاپ تو پڑی تھیں۔ ہمیں بھی بتاؤ کیا کیا دیکھا تم نے جاگتے میں۔" وہ اُس کے پاس ہی آکر بیٹھ گیا۔

"میں یہ سوچ رہی تھی بھیّا کہ اس وقت میرا جانا کسی طرح بھی ٹھیک نہیں۔"

"آخر کیا بات ہو گئی۔" اوینا ش یکایک کھڑا ہو گیا۔

"بات تو کچھ بھی نہیں سوچتی ہوں میرے جانے کے بعد لکشمی اکیلے گھر میں اُداس ہو کر نہ رہ جائے اور پھر بابو جی بھی......"

"ارے چھوڑو دیدی یہ سب تم بہانے بنا رہی ہو میں خوب سمجھتا ہوں۔" اُس کی بات کاٹتے ہوئے وہ افسردہ لہجہ میں بولا۔ "بابو جی اور لکشمی کو تم ہر دم بیمار اور اداس پڑی ہوئی اچھی لگتی ہو کیا۔ کیا یہ لوگ نہیں چاہتے کہ تم اچھی ہو جاؤ یا تمہارا دِل بہلے۔ ہٹاؤ پھر رہنے دو۔ میں تمہیں مجبور نہیں کرتا اور اسکا مجھے حق بھی کیا ہے۔ تم سوچتی ہو گی اِس طرح غیروں میں کیسے چلی جاؤں۔"

"نہیں نہیں ایسا نہ کہو اوینا ش میرے بھیّا" موہنی اُس کا ہاتھ پکڑ کر بھرّائی ہوئی آواز میں بولی یہ تو بھگوان کو معلوم ہے کہ میں تمہیں کیا سمجھتی ہوں اور ماں جی کو دیکھنے کو تو اب میرا من اور بھی بے چین ہو رہا ہے۔ تم نہیں

سمجھ سکو گے۔ اُن کے سینے سے لگ کر میں ماں کو اور سارے دُکھوں کو بھول جانا چاہتی ہوں پر کیا کروں۔ کیسے تمہیں سمجھاؤں۔ ایسا ہے کہ میں تھوڑا اور ٹھیک ہو جاتی تو چلتی ابھی تو میرے اندر کہیں آنے جانے کی ہمت بھی نہیں ہے تم ماں سے کہنا اگر وہ تھوڑے دن کے لئے مجھ سے یہیں آکر مل لیں تو بہت اچھا ہو۔"

"ماں کے پاس جا ہی کون رہا ہے۔" اویناش نے ایک اور حربہ آزمایا۔

"تو پھر کہاں جاؤ گے؟" موہنی نے معصومیت سے پوچھا۔

"جدھر منہ اُٹھے گا چلا جاؤں گا اتنی بڑی دنیا پڑی ہے کہیں تو میرے لئے جگہ ہو گی۔"

"کیسی باتیں کرنے لگے تم اویناش کچھ تو سوچو کیا ہو گیا ہے تمہیں۔" موہنی اُس کندھے پر سر رکھ کر رو پڑی۔ "ماں کا خیال بھی نہیں آیا تم کو اتنی سی بات پر کیا کیا سوچنے لگ گئے۔"

"نہیں مجھے کوئی نہیں چاہئے اب۔ ماں ہو بہن ہو کوئی ہو مجھے کسی کی ضرورت نہیں ہے۔ چھوڑ دو مجھے۔ تمہارے یہ آنسو مجھے روک نہیں سکیں گے۔ میں سیدھا ایسی جگہ جا کر چھپ جاؤں گا جہاں کوئی مجھے جانتا تک نہ ہو یا کسی تیز چلتی ہوئی گاڑی کے آگے جا کر لیٹ جاؤں گا یا کسی دریا میں چھلانگ لگا دوں گا یا پھر کوئی ایسی چیز کھا کر سو رہوں گا کہ صبح کو میری لاش ہی بستر سے نکلے گی۔"

اویناش نے اپنے حربہ کو ناکام ہوتے دیکھ کر سب سے سخت اور آخری وار کیا جو کارگر ہو کر رہا۔ موہنی سے کچھ بولا نہ گیا وہ جیسے سکتے کے عالم میں آنکھیں پھیلائے اُس کو بس دیکھتی ہی رہ گئی۔

"کیا ہو رہا ہے دیدی تمہیں؟" لکشمی جو پیچھے کھڑی سب سُن رہی تھی جھپٹ کر اویناش کے منہ پر ہاتھ رکھتی ہوئی تیز آواز میں بہن سے بولی۔ "بیکار کی باتیں لے کر بیٹھ گئیں۔ چلی جاؤ گی تو کونسا غضب ہو جائے گا۔ نہ مجھے کچھ ہو گا نہ بابو جی کو۔ تم اچھی

ہو جاؤ ہمارے لئے اِس سے زیادہ اور کیا ہے۔ اور بھیّا تم بھی بڑے خراب ہو۔ ایسی باتیں کرتے ہو میرا دِل تو نہ جانے کیا کیا ہو گیا۔" اویناش کی طرف پلٹ کر اُس نے کہا۔

"اور کیا کہوں پھر؟" اچھّا تو میں چلتا ہوں اب۔ وقت خراب کرنے سے کیا فائدہ۔" وہ اُٹھنے ہی والا تھا کہ موہنی نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"نہیں نہیں تم اکیلے نہیں جاؤ گے۔ میں بھی چلوں گی تمہارے ساتھ۔ تم دِل چھوٹا نہ کرو بھیّا۔ تمہیں ناراض کر کے میں یہاں چین سے کیسے رہ سکوں گی؟"

"ہاں بھیّا تم نراش نہ ہو۔" لکشمی نے بھی اُس کی دلدہی کرتے ہوئے کہا۔ "ان کی تو بس ایسی ہی باتیں چلتی ہیں۔ بات یہ ہے کہ عقل ذرا کم ہے ہماری دیدی کے پاس تم تو خواہ مخواہ ہی پریشان ہو گئے تھے۔ میں ابھی ان کا سامان ٹھیک کرتی ہوں۔ کل ہی تو جانا ہے نا۔

"یہ ہے دیکھو۔ کتنی اچھّی کتنی سمجھدار بہن ہے۔ مان گئے بھئی۔" اویناش نے خوش ہوتے ہوئے لکشمی کا سر اپنے کاندھے سے لگاتے ہوئے کہا اور پھر سب ہنسی خوشی کھانا کھانے میں مصروف ہو گئے۔

جب تک رکشا نظر آتی رہی موہنی کی نند بملا دروازے سے نہیں ہٹی پھر جب وہ نظر سے اوجھل ہو گئی تو وہ دھیمے دھیمے چلتی ہوئی صحن میں آ کر چارپائی پر خاموش اور کھوئی کھوئی سی ایک ہاتھ پر اپنا ماتھا ٹکا کر بیٹھ گئی۔

یہ کچھ ٹھیک نہیں ہوا اُس نے سوچا نو بجنے کو ہیں لُو میں اچھی خاصی تیزی آتی جا رہی ہے ابھی سے اور شروع جون کی لُو آٹھ بجے سے ہی ہوا میں گرمی آنے لگتی ہے اتنی گرمی میں یہ لوگ گاڑی پکڑیں گے۔ ستیش کو ویسے ہی تیز بخار معلوم ہوتا تھا آنکھیں اُس کی سُرخ ہو رہی تھیں سانس بھی جانے کیسے کیسے لے رہا تھا اُف مجھے بھی کیا ہو گیا تھا۔ کم سے کم میں ہی اُن کو روک لیتی۔ شام کو ہی چلے جاتے اور رات تک ٹھنڈے ٹھنڈے گھر پہونچ ہی جاتے۔ موہنی خود ہی نڈھال ہو رہی ہے وہ کس طرح بیمار کو سنبھال کر گھر تک لے جائے گی۔ ایک پتھر تھوڑا پگھل رہا تھا لیکن بیکار اب کیا ہو سکتا تھا۔ اور پھر اُس کو موہنی کی آنکھیں یاد آئیں۔ کتنی ویرانی کتنا غم تھا ان کی آنکھوں میں اپنا گھر چھوڑنا اور ایسے حالات میں آسان نہیں ہے۔ ماں باپ کے گھر لڑکی کو کتنا ہی سُکھ کیوں نہ ہوں اپنا گھر جس میں وہ بدا ہو کر آتی ہے کبھی خوشی سے چھوڑنا پسند نہیں کرتی۔ اور اُس کو اپنا گھر چھوڑنا یاد آ گیا۔ اس کے شوہر کے مرنے کے بعد پہلے پہلے اُس کے دیور دیورانی کی بے رُخی اور پھر ہر وقت کے لڑائی جھگڑے سے پریشان ہو کر وہ ہمیشہ کے لئے اپنی لڑکی

کو لیکر اپنے میکے آگئی تھی۔

یہ بھی اچھا ہی تھا کہ اُس کے شوہر نے اُس کے نام پچیس ہزار کا بیمہ کرالیا تھا اور وہ روپیہ اس کے مرنے کے بعد اس کو مل گیا تھا۔ کم سے کم لڑکی کی شادی کا بوجھ تو ان لوگوں پر نہ پڑے گا وہ انہیں خیالوں میں گُم تھی کہ اُس کی ماں کے زور سے چلاّنے کی آواز آئی۔

"بملا او بملا اری کہاں چلی گئی۔ جتنا دودھ تھا سب بلّی پی گئی۔"

"پی جانے دو ماں اتنا سا دودھ بلّی پی گئی تو کیا ہوا۔ آدمی ہی مر جاتا ہے تو کوئی کیا کر لیتا ہے کسی کا دل ٹوٹ جاتا ہے کسی کی دنیا اجڑ جاتی ہے تو دوسروں کو کیا دُکھ ہوتا ہے۔ تم تو اتنے سے دودھ پر ایسے چلاّ رہی ہو کہ نہ معلوم کیا ہو گیا۔"

"کیسی اُکھڑی اُکھڑی باتیں کر رہی ہے دماغ تو ٹھیک ہے تیرا؟"

"ہاں پاگل ہی ہو گئی ہوں۔"

"تو ہو جاؤ پاگل منع کس نے کیا ہے۔" پھر سامنے دیکھتے ہوئے "کیا وہ کنجنی چلی گئی اور کچھ تو نہیں لے گئی اپنے سامان کے ساتھ۔"

"ایسا تو نہ کہو ماں۔ ایسی بُری تو وہ نہیں ہے۔ وہ خود ہی تمہیں بلوا رہی تھی کہتی تھی۔ ماں جی کو بُلا لو کبھی وہ سوچیں کہ بتائے بنا ہی چلی گئی کچھ لے تو نہیں گئی۔ روتے روتے آنکھیں سوج گئی تھیں اُس کی۔ بملا بھی اپنے آنسو پونچھنے لگی۔ اپنا گھر چھوڑنا کِسے اچھا لگتا ہے۔ بیمار بھائی کو لیکر اتنی گرمی میں گھر سے نِکلی۔ اتنے پر بھی میں دروازے پر کھڑی ہوئی جا کر تو مجھے نمستے کیا۔ میرا دِل تو سچ بہت دُکھا اس کو اس طرح جاتے دیکھ کر یہ سب تم نے اور پتا جی نے اچھا نہیں کیا ماں!"

"کیا کہا؟" ماں زور سے گرجی۔ "کچھ منتر ونتر تو پڑھ کر نہیں پھونک گئی وہ تیرے اوپر اب سے میری کسی بات میں بولیں تو اچھا نہیں ہو گا۔ سمجھیں۔

تم میری اولاد ہو ماں نہیں ہو جو مجھے سمجھانے بیٹھی ہو۔"

بملا آنکھوں میں آنسو لئے ہوئے برآمدے میں پڑی ایک چارپائی پر جا کر اوندھی لیٹ گئی اور اندر سے آنے والی آوازوں کو پڑی سنتی رہی جو کھڑکی سے بالکل صاف اُس کے کانوں تک آ رہی تھیں۔ پتھر اب پوری طرح پگھل چکا تھا لیکن بے سود وہ کسی طرح بھی اپنے ماں باپ اور اِس گھناونے ماحول سے بغاوت نہیں کر سکتی تھی ایک مجبور عورت جو پوری طرح اپنے ماں باپ کے رحم و کرم پر تھی۔ اس سے پہلے بھی دو ایک بار اُس نے سوچا تھا کہ کوئی چھوٹی موٹی نوکری کر لے تاکہ کچھ دیر تو گھر سے باہر جانے کا موقع ملے۔ لیکن اُس کی ماں کبھی اس پر راضی نہ ہوئی اور اتنی سی تعلیم پر نوکریاں ملتی ہی کہاں ہیں۔ شادی سے پہلے اُس نے پرائیویٹ طریقہ سے صرف ہائی اسکول ہی پاس کیا تھا کہ اُس کی شادی ہو گئی اور وہ بیوہ بھی ہو گئی۔ آہ وہ کیا کرے۔ کس طرح موہنی کو واپس لائے اور کیسے ماں باپ کو سمجھائے اُس کو رہ رہ کر یہی خیال آئے جا رہا تھا۔ چلتے وقت موہنی کی آنکھوں نے نہ جانے کیسا جادو کر دیا تھا کہ وہ بدل کر ہی رہ گئی تھی۔ افسوس موہنی کو اِس حالت میں دیکھ کر اُس کی ماں تو شائد فوراً ہی چل بسے۔ کتنے سال سے بیمار چلی آ رہی ہے۔ سُنا ہے پچھلی بار تو اُس کی حالت بہت ہی خراب ہو گئی تھی بس بچ ہی گئی تھی۔ اور پھر میں جب اپنے گھر سے یہاں آئی تھی تو ہماری ماں نے کتنے دن تک کھانا بھی نہیں کھایا تھا اور کیسی کمزور ہو گئی تھی حالانکہ اُسکی صحت تو ہمیشہ سے بہت اچھی رہی ہے۔ لیکن موہنی کی ماں۔ وہ تو ہڈیوں کا ڈھانچہ ہے بس۔ اور پھر اُس موہنی کی صورت یاد آ گئی۔ چلتے وقت جب وہ کنڈی ہاتھ میں لئے کھڑی اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی تو چہرہ اُس کا کیسا پیلا ہو رہا تھا جیسے کسی نے ہلدی پوت دی ہو۔ کچھ دن سے کمزور بھی تو کتنی ہو گئی ہے۔ کوئی وزن کی چیز اُٹھاتے ہوئے ہاتھ کانپ جاتے ہیں سانس الٹ پلٹ ہو جاتا ہے۔ جب شادی ہو کر آئی تھی تو کیسا لال لال چہرہ تھا۔ مُسکراتی تھی تو لگتا تھا کہ دو گلاب

کھل گئے ہوں۔ ہمارا پرکاش بھی پاگل ہے بالکل اُس کو اپنے بھائی پر غصّہ آرہا تھا۔ لڑکا ہو کر اتنا ڈرتا ہے ماں اور پتاجی سے۔ اپنی کوئی مرضی ہی نہیں کوئی قدم اُن سے پوچھے بغیر نہیں اُٹھا سکتا۔ ہر بات میں اُن کا محتاج ہو کر رہ گیا ہے لیکن ایسا اِن دونوں نے ہی تو بنا دیا ہے اِس کو۔ ایسے بچّے کہیں دنیا میں کچھ کر سکتے ہیں ساری صلاحیتیں دب کر رہ جاتی ہیں۔ اگر یہ سخت ہو جاتا تو ماں اور پتاجی بھی ٹھیک ہو جاتے۔ اب تو لڑکے ذرا سی غلط بات اپنی بیویوں کے لئے نہیں برداشت کرتے۔ اب سامنے والے وکیل صاحب کا لڑکا ہی دیکھو کیسا ٹھیک کر لیا سب کو۔ ماں باپ بہن بھائیوں نے شروع میں کتنے دُکھ پہونچائے اس کی بیوی کو لیکن اُس نے لڑائی کر کے غصّہ سے پیار محبت سے جیسے بھی بنا سمجھا لیا سب کو اور اب کوئی بات بھی نہیں اُن کے یہاں ماں باپ پوری دنیا سے لڑ سکتے ہیں لیکن جب جوان بیٹا سختی اور ضد پر اُتر آئے تو اُن کے سارے کس بل نکل جاتے ہیں۔ اور پھر اُس کے تصوّر میں اُس کے باپ کا چہرہ آیا۔ پتاجی بھی ضرورت سے زیادہ ہی سخت ہیں۔ کم سے کم مردوں کو تو ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ وہ اگر چاہتے تو ماں کو سمجھا سکتے تھے لیکن وہ خود ہی ماں سے گھبراتے ہیں۔ نہ معلوم اِس عمر میں مرد عورت سے اتنا ڈرنے کیوں لگتا ہے۔ سچّی بات کہتے ہوئے اِس طرح جھجکتا ہے۔ جیسے ماتحت اپنے افسر سے۔ کچھ بھی ہو سب سے زیادہ قصور پرکاش کا ہی ہے۔ ایسی خوبصورت نیک اور وفادار بیوی کیا اب مِل جائے گی اُس کو کون جانے چلتے وقت موہنی کی آنکھوں میں جو ایک طرح کا انتظار اور بے چینی تھی وہ پرکاش کے لئے ہی ہو۔ عورت اپنے پہلے شوہر اپنے پہلے پیار کو ہمیشہ دل میں چھپا کے رکھتی ہے چاہے وہ کیسا ہی ہو۔ آہ۔ اس کی وہ موٹی موٹی آنکھیں روتے میں بھی کتنی سندر لگ رہی تھیں وہ آنکھیں تو میرے من میں اس طرح بس گئی ہیں کہ شائد ہی کبھی نکل سکیں۔ اُن میں کیا تھا کہ میری آنکھیں کُھلیں اور کھلتی ہی چلی گئیں۔ پہلی بلا مر گئی اب ایک نئی بلا نے جنم لیا ہے۔ جس کے دِل میں موہنی اور اُس کے گھر والوں

کے لئے رحم ہی رحم ہمدردی ہی ہمدردی ہے۔ ہائے میری آنکھیں پہلے ہی کیوں نہ کھل گئیں شائد حالات کچھ سُدھر جاتے۔ میرے کہنے سُننے سے ہو سکتا تھا کہ پرکاشن کا حوصلہ بڑھ جاتا اور وہ حالات پر قابو پالیتا۔ لیکن نہیں یہ مشکل تھا وہ پتاجی سے ڈرتا ہی بہت ہے اِس لئے کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا کچھ بھی نہیں۔ لیکن اگر موہنی کو کچھ ہو گیا۔ ایکدم لرزتے ہوئے اُس نے سوچا۔ یا اسکے غم میں اُس کی ماں چلی گئی دنیا سے تو کیا بھگوان ہمیں معاف کر دیں گے ہرگز نہیں۔ اور ہم ہی کیا ہمارے جیسے اور نہ جانے کتنے لوگ ہیں اِس دھرتی پر کسی کو بھی وہ معاف نہیں کرے گا۔ اِس لئے کہ ہم خونی ہیں لٹیرے ہیں ہم سیدھی طرح قتل نہیں کرتے تو کیا ہوا لوگوں کو جلا جلا کر اور ترڑپا ترڑپا کر ختم کرنا کیا قتل نہیں ہوتا روح کا آتما کا قتل تو اور بھی بڑی چیز ہے۔ لیکن ہمارا سماج اس پر ہمیں کچھ نہیں کہتا۔ قانون اور انصاف کی نظر میں بھی ہم بے قصور بنے رہتے ہیں اور سر اونچا کر کے چلتے ہیں۔ جنگلی جانوروں اور درندوں کو شکار کر کے ختم کیا جاتا ہے کس لئے؟ اِسی لئے نا کہ وہ انسان کو نقصان پہونچاتے ہیں اُس کا خون پیتے ہیں۔ لیکن انسان دوسرے انسان کا خون پی لے تو کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوتی اور وہ بڑا نیک شریف۔ پارسا اور عزّت دار بنا پھرتا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اشوک ماں سے یہی تو کہہ رہا تھا اور کبھی کبھی تو اُس کی آواز جوش میں بہت تیز ہو جاتی تھی۔ جب اُس کو معلوم ہوا کہ موہنی چلی گئی اور کس وجہ سے کن حالات میں بیمار بھائی کو لے کر جانے کے لئے مجبور ہوئی تو وہ کتنا دُکھی ہو گیا اور ماں اور پرکاش کو کتنی ہی سخت باتیں اُس نے کہہ ڈالیں جن کا جواب بھی ان دونوں سے ٹھیک طرح نہیں بن پڑا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ میری شادی بھی طے ہونے جا رہی ہے لڑکی مجھے پسند ہے لیکن اُس کے ماں باپ کی اتنی حیثیت نہیں کہ وہ زیادہ جہیز یا روپیہ وغیرہ دے سکیں اس لئے میں نے ماں اور پتاجی سے صاف کہہ دیا کہ اگر آپ لوگوں نے کچھ مانگنے کی

بات کی تو میں کبھی شادی نہیں کروں گا اور گھر کو اور آپ سب کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے کہیں دور چلا جاؤں گا۔

"پھر کیا ہوا؟" ماں نے پوچھا اور جب اُس نے بتایا کہ اُس کی اِس بات سے کچھ دن تو ہلکی ہلکی جھنجھناہٹ کی آواز سُنائی دی گھر میں لیکن چھوٹی بہن مدھو کے آنے سے معاملہ ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔ اُس نے اور اُس کے پتی جگدیپ نے بھی اُس کا ساتھ دیا اور سب کے کہنے سُننے سے دماغ سیدھے ہو گئے دونوں کے؛ تو ہماری ماں نے بڑے تعجب کا اظہار کیا۔ اپنی بہن اور بہنوئی کو پاگل بیوقوف اور نہ جانے کیا کیا بنا کر پھر اُس کو دھمکانے بیٹھیں کہ تو بیٹا ہو کر ماں باپ کا اپمان کرتا ہے اور وہ بھی ہمارے سامنے تو اُس کو اور بھی غصہ آ گیا اور آواز اُس کی تیز ہو گئی۔ اور پھر جو باتیں اُس نے کہیں میں تو حیران رہ گئی سُن کر کتنے اچھے وچار ہیں اور کیسے آدرش ہیں اِس کے۔ ہماری قوم اور ہمارے ملک کے سبھی لڑکے اگر اِس کی طرح ہو جائیں تو پھر ہمارا یہ سنسار سورگ ہی میں نہ بدل جائے کتنی صحیح اور سچی بات اُس نے کہی۔ کہنے لگا۔ جہاں تک ماں باپ کی عزت اور خدمت کا سوال ہے اولاد کو چاہئے کہ جی جان سے کرے اور جو بھی اچھی باتیں وہ بتائیں اُن پر آنکھ بند کر کے عمل کرے لیکن جب دیکھے کہ ماں باپ غلط راستے پر جا رہے ہیں تو اولاد ہی کا یہ فرض بھی بنتا ہے کہ وہ اُن کو روکے سمجھائے اور سچائی کے راستے پر لے جانے کی کوشش کرے میں یہ نہیں کہتا کہ بے ادبی یا بدتمیزی کے ساتھ اُن سے پیش آیا جائے لیکن جب تمیز سے یا پیار محبت سے کام نہ چلے تو تھوڑی سی سختی بھی ضروری ہے جیسے مثال کے طور پر بچپن میں ہم ضد کرتے ہیں تو ماں باپ کو جھکنا ہی پڑتا ہے اپنی محبت سے مجبور ہو کر اسی طرح اولاد بڑی ہو جائے تو ماں کی محبت کا انداز تو نہیں بدل جاتا۔ ایک ایک لفظ پر زور دے کر وہ اسی طرح کہتا رہا۔

آپ کے خیال میں اگر ماں باپ کسی بے گناہ کو قتل کرنا چاہتے ہیں

یا کسی کی کوئی چیز چھین لینا چاہتے ہیں تو ہملادگی بھی اُس کو بس ویسا سمجھ کر بیٹھی تماشہ دیکھتی رہے۔ ایسی اولاد سے زیادہ پاگل اور بیوقوف دنیا میں کوئی ہو نہیں سکتا اور اُس کو کسی طرح بھی معاف نہیں کیا جا سکتا اسی طرح ہمارے اِس گندے سماج میں ایسے لوگ معافی کے قابل نہیں ہیں جو جہیز اور روپیہ کی صورت میں کم حیثیت انتہائی مجبور۔ بے بس اور معصوم لوگوں کے گھروں پر ڈاکہ ڈالتے ہیں۔ آپ لوگ مجھے بتائیں موسی کہ ایک بڑے ڈاکو میں اور ایسے لوگوں میں کیا فرق ہے۔ ڈاکو بھی تو کہتے ہیں کہ یا تو ایک بڑی رقم اور سامان ہمارے حوالے کر دو ورنہ مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ اور یہی ہم عزّت والے شریف اور سفید پوش لوگوں کا وطیرہ ہے کہ یا تو اتنا سامان جہیز کی شکل میں اور اتنی رقم لاؤ کہیں سے لاؤ کسی طرح بھی لاؤ ورنہ تمام زندگی گھٹ گھٹ کر مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ یعنی ہم تمہاری بے زبان گائے جیسی لڑکی تمہارے جگر کے ٹکڑے کو دلہن بنا ہوا چھوڑ کر اس کی خوشیوں اور ارمانوں کو پیروں تلے روندکر اور شہنائیوں کا گلا گھونٹ کر پوری پوری زندگی خون کے آنسو رونے پر مجبور کر کے واپس چلے جائیں گے اور غور کیجئے تو خوشیوں کی موت اصل موت سے کہیں بھیانک ہوتی ہے اس سے تو اُس کو اور اُس کے گھر والوں کو زہر دے کر چلے جائیں تو زیادہ بہتر ہے تاکہ ان کو اپنی عزّت اور حسرتوں کے خون میں نہانا تو نہ پڑے لیکن اِس میں پکڑ ہے اور اُس میں کوئی پکڑ نہیں۔

دوسری صورت میں کسی چلے بہانے یا کل کے دعدوں کے سہارے اُس غریب کو بدا کر کے لے بھی گئے کہ تمام عمر زلا زلا طعنوں کی شکل میں زہریلے انجکشن لگا لگا کر اُس کو بھی موت کے دروازے پر پہونچا دیں گے اور اُس کے ماں باپ کو بھی۔ یعنی دونوں باتیں پوری ہو گئیں نا؟ قتل بھی اور ڈکیتی بھی۔ لیکن ان بے رحم ڈاکوؤں کی درندگی نہ سماج کی اندھی آنکھوں کو نظر آتی ہے اور نہ قانون ہی اِس کو زیادہ اہمیت دیتا ہے اب دوسری طرح کے یعنی بے نقاب ڈاکوؤں

اور بڑے لوگوں کی بات سُننے جن کو ہمارا سماج بھی بُری نگاہ سے دیکھتا ہے اور قانون ہی بہرحال اُن کے پیچھے لگا ہی رہتا ہے۔ کہیں اُن کو گولی مارنے کا حکم ہوتا ہے تو کہیں زندہ گرفتار کر کے پھانسی کے تختے پر چڑھائے جانے کا۔ چلئے یہ بھی ٹھیک ہے مجرم کو اُس کے کئے کی سزا ملنی چاہئے۔ لیکن اگر ٹھنڈے دِل سے سوچا جائے اور انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو یہ کُھلے مجرم ان چُھپے ہوئے عزّت دار مجرموں کے مقابلے میں زیادہ بہتر ہی نظر آئیں گے۔ ان کا اپنا ایک کردار ہوتا ہے کچھ اخلاقی قدریں ہوتی ہیں۔ بڑے سے بڑا ڈاکو یا ایک بدنام ترین آدمی بعض دفعہ ایسے بڑے کام کر جاتا ہے کہ ہمارے یہ نقاب پوش سفید لباس والے ڈاکو اور چور سو جنم لیکر بھی نہیں کر سکتے۔ اکثر بڑے ڈاکوؤں کے بارے میں آپ نے سُنا ہوگا کہ سیٹھ ساہوکاروں کو لوٹتے تھے! اور غریب بے کس لوگوں کا پیٹ بھرتے تھے اور ان کے تن ڈھانکتے تھے۔ یہ لوگ باہر سے بے شک خونخوار نظر آتے ہیں لیکن کبھی کبھی ایک معمولی سی بات ان کو انتہائی کمزور بنا دیتی ہے وہ جس گاؤں قصبے یا شہر کے ہوتے ہیں وہاں کبھی بھول کر بھی ہاتھ نہیں ڈالتے وہاں کی ہر لڑکی ان کی بیٹی ہوتی ہے ہر عورت ماں یا بہن ہوتی ہے جس کے لئے وہ بڑی سے بڑی قربانی دے دیتے ہیں اُس کی عزّت کے لئے یہاں تک کرتے ہیں کہ اپنا اور اپنے ساتھیوں کا خون بہانے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ بتائیے ہم میں سے کوئی ایسا کر سکتا ہے اتنا بڑا دِل ہے ہمارے پاس۔ اور سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ اچھے بھلے لوگوں کو بُرا آدمی بناتا کون ہے؟ یہ بھی ہم ہی ہیں ہمارا یہ بے رحم سماج ہی تو ہے جو ان کو غلط راستوں پر چلنے کے لئے مجبور کرتا ہے۔ اگر شروع میں ان کی معمولی سی غلطی یا چھوٹی موٹی بھول کو ہم پیچھے ڈال دیں ان کو حقارت کی نظر سے نہ دیکھیں ان کی نامزد رپورٹیں لکھوا کر ان کو پولیس کے حوالے نہ کریں تو شاید ایک بھی آدمی برا نہ بنے۔ ان سب بُرائیوں کو ہم خود ہی تو جنم دیتے ہیں۔ ایک آدمی بھوک سے بلبلا کر یا اپنے

ننھے معصوم بچّوں کو فاقے کی تکلیف اور بے چینی سے بچانے کی خاطر یا کسی اور شدید ضرورت یا خواہش کے تحت کہیں کہیں چھوٹی موٹی چوری کرنے پر مجبور ہو جائے تو بجائے اس کے کہ ہم نرمی سے اُنکی پریشانیاں اور اس کے مسئلے معلوم کر کے اُس کی تھوڑی مدد کر دیں اور اس کی برائیاں محبت کے ساتھ سمجھا کر سیدھے راستے پر لانے کی کوشش کریں ۔ ہم اُس کو پولیس کے حوالے کر دیتے ہیں جہاں مار مار کر اُس کی ہڈیاں اور پسلیاں ایک کر دی جاتی ہیں اور اِسی طرح اُس میں بغاوت پیدا کر دی جاتی ہے جو انسان کی فطرت میں شامل ہے اور پھر وہ برائیاں بجائے کم ہونے کے بڑھتی ہی چلی جاتی ہیں اور نتیجہ ظاہر ہے۔

محبّت اور خلوص میں بڑی طاقت ہے جو کام محبّت اور پیار سے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ پورا ہو جاتا ہے بڑی سے بڑی سختی اور جبر سے نہیں ہو پاتا اس کے علاوہ اور بھی بہت سی قسمیں ہیں ڈاکوؤں کی جو ہمارے اس پیارے دُلارے سماج میں پائے جاتے ہیں۔ ہم میں رشوت خوروں کی کوئی کمی نہیں ۔ آپ سب جانتے ہیں۔ جو خصوصاً غریب لوگوں پر ایک بڑا ظلم ہے۔ اور سود خوری ؟ یہ ہمارے مہاجن لوگ دیوتا ہیں ؟ اس کے علاوہ چور بازاری۔ ذخیرہ اندوزی ۔ اقربا پروری ۔ اسمگلنگ اور ہزاروں طرح کی بے ایمانیاں یہ سب تو ہے ہی ایک لالچی ڈاکٹر کو آپ بُرا کہیں نہ کہیں لیکن میں ضرور کہوں گا جو غریب فاقہ مست اور بے بس مریضوں پر کبھی رحم نہیں کھاتا جو آٹھ آنے کی دوائی کے آٹھ روپے اُن لوگوں سے جبر کر کے وصول کرتا ہے جو چار آنے بھی دینے کی سکت بھی نہیں رکھتے اور بعض وقت تو وہ سانپ کی طرح ایسے وقت میں بھی پھنکار مارتا ہے اپنی فیس کے لئے جب کوئی لاچار انسان شدید تکلیف کی حالت میں اُس کی آنکھوں کے سامنے دم توڑ رہا ہوتا ہے اور اُس کے نادار اور بے بس قریبی رشتہ دار سخت قسم کی مایوسی اور کرب سے دوچار

ایسے وقت میں اُس کا منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں اور اپنے بے پناہ غم کو دبا کر جیسے بھی بن پڑتا ہے پہلے اس کی فیس کا انتظام کرتے ہیں اور بعد میں اپنے مردہ عزیز کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور وہ اپنی جیب گرم کر کے اُدھر نظر ڈالے بغیر بڑے اطمینان سے اپنا بیگ اُٹھا کر باہر چل دیتا ہے۔ اور ایک لالچی وکیل کو آپ کیا کہیں گے جو ایک معمولی کام کے لئے کسی بھی مجبور اور انجان آدمی کو لوٹ کر رکھ دیتا ہے اور نت نئے فریبوں کے جال میں اُس کو الجھائے ہی رکھتا ہے۔ ایسے کام دن رات ہی ہوتے ہیں اور یہ کتنے گھناونے ناسور ہیں ہماری سوسائٹی کے لیکن کوئی نہیں دیکھتا اوپر سے ہماری اس سوسائٹی اور ہمارے سماج کے ٹھیکے دار بڑے فخر بڑی عزت اور وقار کے ساتھ گردن اکڑائے گھومتے نظر آتے ہیں۔"

اشوک کی زبان چل رہی تھی وہ بہت جوش میں تھا۔ ماں اور پرکاش خاموشی سے اس کی تیکھی باتیں زہر مار کر رہے تھے۔ کسی کے پاس اُسکی معقول باتوں کا کوئی جواب نہ تھا۔ اور اب کمرہ میں مکمل خاموشی چھاگئی تھی۔ پھر یکایک ہی اشوک اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"اچھا میں تو چلا موسی۔" اس نے اپنی اٹیچی کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟ اتنی جلدی کیوں؟ تو تو کہہ رہا تھا چار دن چھٹی ابھی باقی ہے۔"

"ہاں ہے تو لیکن اب میں یہاں ایک منٹ بھی نہ رُک سکوں گا۔"

"کیوں؟ آخر کس وجہ سے؟" پرکاش بھی بولا۔

"بس یونہی۔" اشوک نے آہستہ سے کہا۔ "تمہاری بیوی کا اُداس چہرہ اور آنکھیں بار بار مجھے یاد آئیں گی۔ میں تمہاری طرح پتھر تو ہوں نہیں۔ اور پھر پاپ سے میں ویسے ہی میں دور بھاگتا ہوں۔"

اور پھر سب کے روکنے کے باوجود اشوک تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا دروازے کے باہر چلا گیا۔ ماں کے چہرہ پر ندامت اور پچھتاوے کا ہلکا سا رنگ آیا جو فوراً ہی غائب بھی ہو گیا۔ پر کاش کافی متاثر ہو گیا تھا لیکن اب ہو بھی کیا سکتا تھا۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

اتنی بڑی بڑی باتیں گذر جانے کے بعد موہنی کی واپسی کا تو کوئی سوال ہی نہیں رہ گیا تھا۔ دوسرے ماں اور پتاجی کو اُس کی بیماری بھی بہت کھٹکنے لگی تھی ان کے لئے یہی بہانہ کافی تھا حالانکہ اُس کو اِس حال تک پہونچانے والے بھی یہی لوگ تھے۔ بملا آہستہ سے اُٹھی اور ایک ٹھنڈی سانس کھینچ کر پھر اپنے کام کاج میں لگ گئی۔

"ہیلو پرکاش! کہو کیسے ہو؟ یہ کیا حال بنا رکھا ہے؟"
"ٹھیک ہی ہوں۔"
"ٹھیک تو نہیں ہو۔ یہ اُلجھے اُلجھے بال۔ یہ تھکا تھکا سا چہرہ۔ یہ سوچتی ہوئی اور کہیں دور بھٹکتی ہوئی آنکھیں اور یہ کھوئے کھوئے انداز۔ آخر یہ سب کیا ہے اِدھر میں بھی بیوی کی بیماری سے بہت پریشان رہا۔ تم سے بات کرنیکا موقع ہی نہ مل سکا اتنے دن تک۔ آؤ ذرا چائے پئیں گے اور اطمنان سے بیٹھ کر باتیں کریں گے تھوڑی دیر۔" پرکاش کے دفتر کے ساتھی اور دوست اجے نے اُسکا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف لے جاتے ہوئے کہا۔
"چھوڑو تو یار۔ اِس وقت پریشان نہ کرو۔ میں چائے وائے نہیں پیوں گا اِس وقت طبیعت ٹھیک نہیں ہے ذرا گھر جاؤں گا۔" پرکاش نے ہاتھ چھڑاتے ہوئے نہایت بیزاری سے کہا۔
"ارے واہ عجیب چیز ہو یار آخر کاٹنے کو کیوں دوڑتے ہو۔ چلو۔" اُسنے زبردستی اُس کا بازو پکڑ کر گھسیٹا اور ایک میز کے گرد بیٹھتے ہوئے چائے کا آرڈر دینے کے بعد اُس کی طرف دیکھ کر بولا۔
"ہاں اب بتاؤ کیا پریشانی ہے۔ بھابی سے کچھ لڑائی وڑائی ہو گئی ہے کیا؟ لیکن وہ تو لڑنے لائق چیز ہی نہیں ہے سنا ہے اتنی اچھی سیدھی سادی

سُندر اور سوشیل ہے کہ بس دیکھتے ہی جاؤ۔ سُنیتا تو بہت گُن گاتی ہے اُس کے اور ماں بھی۔

اپنی بات ختم کر کے اجے نے ٹٹولنے والی نظروں سے اُس کے چہرے کی طرف دیکھا اور کچھ دیر جواب کا انتظار کرنے کے بعد آہستہ سے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُس نے پھر اپنی بات دُہرائی۔

"وہ یہاں ہے ہی کہاں۔ وہ تو میکے چلی گئی اپنے بھائی کے ساتھ اور لڑائی بھی مجھ سے تو کوئی نہیں ہوئی۔" پرکاش نے دھیمے سے اور رُک رُک کر جواب دیا۔

"پھر کس سے ہوئی؟" اجے کے چہرے پر تجسّس اُبھر آیا۔

"وہ بات ایسی تھی کہ۔ کہ گھر کے حالات کچھ بدل گئے تھے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ ہماری ماں کا مزاج تو تم جانتے ہی ہو کچھ زیادہ ہی سخت ہے اور پتاجی کے غصّہ کا تو ٹھکانہ ہی نہیں۔ آندھی اور طوفان کا روپ دھار لیتا ہے میں تو شروع سے ہی بہت گھبراتا ہوں ان کے غصّہ سے۔ ادھر موہنی بھی کچھ عجیب چڑچڑی سی ہوتی جا رہی تھی۔ بات بے بات بس رونے لگ جاتی تھی۔ پورا پورا دن اپنے کمرہ میں پڑی رہتی تھی بیماری کا بہانہ کر کے۔ بس یہی باتیں ان لوگوں کو کھٹکنے لگی تھیں اب اس کا بھائی اُسے لینے آیا تو کچھ پرانی باتیں بھی نکل آئیں۔"

"وہ کیا؟" اجے نے پہلو بدلتے ہوئے پوچھا۔

"وہ کچھ جہیز اور روپیہ پیسہ کا قصّہ تھا۔ شادی پر پتاجی نے پندرہ ہزار روپیہ کی مانگ رکھی تھی جس میں دس ہزار ہی اُنہوں نے دیئے تھے اور جہیز کے سامان میں بھی کچھ کمی تھی جس کے لئے اُس کے بھائی کی نوکری لگ جانے کے بعد دینے کی بات طے ہوئی تھی لیکن اُس کے لئے بھی اُن لوگوں نے کچھ نہیں کیا ابھی تک۔ میں تو کچھ بولا نہیں۔ اُنہیں سب لوگوں میں آپس میں جھگڑا ہو گیا تھا۔"

"زیادہ گرمی کس کی طرف سے رہی ؟" جیب سے سگریٹ نکالتے ہوئے کچھ طنزیہ لہجہ میں اجے نے سوال کیا۔

"گرمی اور زیادتی تو خیر ہمارے گھر والوں کی طرف سے ہی ہوئی۔ پتا جی نے تو بعد کو یہاں تک کہدیا کہ وہ اپنے بھائی کے ساتھ ابھی چلی جائے گھر سے اور پھر واپسی کی بھی نہ سوچے۔ حالانکہ بھائی اُس کو بیمار ہو گیا تھا یہاں آکر اور ایک ہفتہ سے اُس کو بخار چل رہا تھا۔ لیکن اُس وقت وہ بھی بھڑک گیا اور فوراً ہی چلا گیا بہن کو لیکر۔"

"چہ چہ چہ یعنی بیماری کی حالت میں ہی چلا گیا بہن کو لیکر۔ اور تم کچھ نہیں بولے بیٹھے تماشہ دیکھتے رہے ؟"

"میں کیا بولتا۔ ساتھ میں میری بھی شامت آتی کہ بیوی کی طرف سے بول رہا ہے میں تو ماں باپ کے آگے کبھی بولا ہی نہیں اور پھر بات یہ بھی ہے کہ موہنی کو بھی تھوڑا برداشت کرنا چاہئے تھا لیکن وہ تو نہ جانے کیسی ہو کر رہ گئی تھی۔ مجھ سے بھی بہت کم بات کرتی تھی۔ میں نے دو اِک بار سمجھایا بھی کہ تم خوش رہا کرو بڑے ہیں کچھ کہتے ہیں تو کہنے دیا کرو تمہاری کونسی شان گھٹتی ہے اس پر وہ الٹا رو رو کر اور کوفت پیدا کر دیتی تھی اور ہر دم بیمار ہی بنی پڑی رہتی تھی۔"

"کمال کرتے ہو یار۔" یکایک اجے تیز آواز میں بولا اُس کو اب غصہ آ گیا تھا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تم سخت قسم کے جاہل بیوقوف اور بُزدِل آدمی ہو اور ساتھ ہی نہایت پتھر دِل بھی۔ میں تم کو ایسا ہرگز نہیں سمجھتا تھا۔ پڑھ لکھ کر بھی تم نِرے جنگلی ہی رہے۔ بڑا افسوس ہوا واقعی اسوقت ذرا مجھے بتاؤ تو کہ تم میں اور اُن جاہل اور اُجڈ دیہاتیوں میں کیا فرق ہے جو ماں باپ اور دوسرے گھر والوں کے کہنے میں آکر ذرا ذرا سی بات پر وجہ معلوم کئے بغیر ہی بیویوں کو مارنا پیٹنا شروع کر دیتے ہیں یا اپنی آنکھوں کے سامنے

بیوی کو ذرا سے قصور پر اپنے گھر کے آدمیوں سے پٹتے ہوئے یا زیادتیاں کرتے ہوئے دیکھتے ہیں اور ذرا بھی اہمیت نہیں دیتے اور وہ غریب اگر اپنائیت کے جذبہ کے تحت شوہر سے فریاد کرنا چاہے تو بجائے اُس کا دُکھ بانٹنے کے اُلٹا اُسی کو قصور وار ٹھہرا دیتے ہیں۔ اور پھر کیا ہوتا ہے معلوم ہے؟" اجے کچھ زیادہ جذباتی ہو کر بہک رہا تھا۔" پھر یہ ہوتا ہے کہ رہا سہا دل بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ ہر جذبہ ہر احساس پارہ پارہ ہو جاتا ہے اور وہ غریب پھر خود ہی اپنا تابوت اٹھائے ایک معمولی سے سائے ایک مبہم سے سہارے کی تلاش میں نکل پڑتی ہے اردگرد پھیلے اندھیروں سے گذرتی ٹھوکریں کھاتی ہوئی۔ چھوٹے بڑے پتھروں کے بیچ ڈگمگاتی لڑکھڑاتی ہوئی اور اسی طرح انجانے میں کسی بڑے سے پتھر سے ٹکرا کر اُس کا گھائل اور ناتواں وجود ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جاتا ہے۔ اُف! کتنے بڑے بڑے ظلم ہوتے ہیں عورت پر کہ بھگوان بھی ایک بار کانپ کر رہ جاتا ہو گا۔ اُس نے تو ایک پھول دھرتی پر اُتارا خوشبو کے لئے سجاوٹ کے لئے اور پیار سے اپنے گالوں سے لگانے کے لئے لیکن اس کے بجائے اُس کی پتیاں نوچ نوچ کر اُن کو بیدردی کے ساتھ کچلا جاتا ہے مسلا جاتا ہے اور پیروں سے روندا دیا جاتا ہے۔ کاش۔ کاش ہم بھی دوسروں کی طرح اپنے دماغ کا صدیوں پُرانا زنگ اُتار کر عورت کی عزّت کرنا سیکھتے۔ مہا بھارت میں لکھا ہے۔"

"عورت کائنات کی بہار ہے۔ اُس پر غصہ نہ کھاؤ۔ اُس کا دِل نرم ہوتا ہے اُس پر یقین کرو۔"

حضرت محمد صلعم کا ارشاد ہے۔

"وہ شخص خدا کے سب سے زیادہ نزدیک ہے جو اپنی بیوی کی دِلشکنی نہیں کرتا۔"

مہاتما بُدھ کہتے ہیں۔ عورت کی ہمیشہ عزّت وتکریم کرو۔

چانکیہ کہتے ہیں۔

"عورت ہماری خوشیوں اور غموں کی مبارک حصہ دار ہے اسکا ہمیشہ ساتھ دو۔"

جے برڈ نے کہا ہے۔

"عورت تقدیس اور تعظیم کے لئے پیدا کی گئی ہے۔

اور گوئٹز نے تو یہاں تک کہدیا ہے۔

"انسان کے لئے بھگوان کی سب سے گراں قدر بخشش اگر کوئی ہے تو وہ عورت ہے۔"

اجے بولے ہی جارہا تھا کہ پرکاش کی کھانسی کی آواز پر چونکا اور اسکو دیکھتے ہوئے بڑے درد سے بولا۔

"اب تم خاموش ہو۔ کوئی جواب تمہارے پاس نہیں ہے اور شائد پچھتا بھی رہے ہو لیکن اس سے کیا فائدہ۔ ارے احمق تم کو تو ماں باپ کو سمجھانا چاہیئے تھا اور نہ مانتے تو تھوڑا غصہ بھی کرنا تھا۔ بیوی کی جائز حمائت میں تو کوئی برائی نہیں۔ سسرال میں شوہر بیوی کا خیال نہ کریگا تو کیا دوسرے کریں گے۔ اور پھر تم ہی جب خاموشی سے سب کچھ دیکھتے رہے اور بیوی کو روکنے کی کوشش تک نہیں کی تو اس کو جانا ہی تھا۔ وہ کس کے سہارے یہاں رہتی۔ تمہیں کچھ تو بولنا ہی تھا میرے بھائی۔ ہمارے یہاں دیکھو ماں سنیتا کے اوپر جان دے دیتی ہے۔ میں کبھی سنیتا پر جھوٹ موٹ ہی بگڑ جاتا ہوں تو دوڑ کر اپنے کمرہ سے نکل آتی ہے اور دس باتیں مجھے ٹھونکتی ہے کہ وہ اپنا بھرا گھر ماں باپ۔ بہن بھائی سب ہی کو چھوڑ کر تیرے سہارے تو یہاں آئی ہے اور تو ہے کہ اُس پر بگڑتا ہے اور میں کبھی سنیتا کی سچّی شکایت بھی کرنے بیٹھوں کہ یہ میرے ساتھ جھگڑا کر رہی ہے تو ہنس دے گی اور کہے گی کہنے دے تیری شان کو کونسا بٹہ لگ گیا۔ ابھی نادان ہے دو ایک بچوّں کی ماں ہو جائے گی تو خو ہی عقل آجائے گی۔

تجھے اپنا جان کر ہی تو کوئی شکوہ شکائت کرتی ہے اُس نے کسی چیز کو کہا ہو گا اور تو ٹال گیا ہو گا۔ تو ایسی بھی مائیں ہوتی ہیں۔ جہیز یا روپیہ ہمیں ہی کونسا زیادہ ملا تھا لیکن مجال ہے جو کبھی ماں کی زبان پر کچھ بھی آیا ہو مجھے ہی مذاق میں بھی اُسنے کچھ کہنے دیا ہو۔

میں کہتا ہوں اگر ہمارے بڑے بوڑھے تھوڑی سی عقل اور سُوجھ بُوجھ سے کام لیں تو ہمارے گھر برباد ہونے سے بچ سکتے ہیں۔ یہ کیسی ممتا اور کیسا پیار ہے کہ ماں باپ اپنے ہی ہاتھوں اپنے بچّوں کی زندگیاں اُجاڑ کر رکھ دیتے ہیں۔" وہ برابر بولے جا رہا تھا اور پرکاش دم بخود بڑے غور سے اور بڑی حیرت سے ساتھ اُس کی باتیں سُن رہا تھا اجے نے کچھ دیر ٹھہر کر پھر اپنی بات شروع کر دی۔

وہی بیماری اور چڑچڑے پن کی شکائت تو اچھے بھلے حالات میں کسی بھی عورت کو کیا پڑی ہے کہ روئے دھوئے ٹسگے اور صحت کو گھُن لگائے۔ غم تو صحت کا قاتل ہے ہی اور جب صحت نہیں رہے گی تو دِل دماغ اور ہر حصّہ بدن کا کمزور ہوتا چلا جائے گا اور پھر چڑچڑا پن مزاج میں آئے گا ہی۔ صبر اور برداشت کی طاقت کہاں سے آئے گی سوچو۔ اور کمزور اور بے بس کا آخری حربہ رونا دھونا ہی ہے وہ روئے گی نہیں تو قہقہے لگائے گی۔ کسی کو پے در پے طعن و تشنِ اور تکلیفیں دے کر پہلے تو ادھ مرا کر دیا جائے اور پھر ان حالوں کو خود ہی پہونچا کر اس کے رونے یا فریاد کرنے پر بربریت اور درندگی کا مظاہرہ کیا جائے یہ کہاں کی انسانیت ہے صاحب۔ اگر اُدھر سے ظلم تھے تو تمہارا فرض کیا تھا؟ تم کو تو اُلٹا نمک پاشی کرنے کی بجائے اُس کے زخموں پر اپنے بھرپور پیار اور دلجوئی کا پھایا رکھنا تھا لیکن تم یا تو خاموش تماشائی بنے رہے اور سمجھانے کی کوشش بھی کی تو اُسی غریب کو۔ جو پہلے نیم جان ہو رہی تھی۔ یعنی کیا خوب عقل مندی فرمائی آپ نے اُلو کہیں کے

وہ جو کسی نے کہا ہے۔

"کسی میں دم نہ تھا اہل ستم سے جا کے کچھ کہتا
مگر بے کس کو سمجھانے سب آئے۔ بار بار آئے"

اور یہ جہیز اور روپیہ پیسے کا لین دین تو اب اِس زمانے میں ویسے ہی کم ہوتا جا رہا ہے بلکہ کچھ دن میں ختم ہی سمجھو۔ زیادہ پڑھے لکھے اور ترقی پسند لڑکے تو اِسکو بہت بُرا ماننے لگے ہیں میرے دوست۔ وہ کچھ پُرانے لوگ اِن واہیات اور لچر قسم کے رواجوں کو ابھی تک گلے سے لگائے بیٹھے ہیں یہ سب اب ختم ہونا ہی چاہیئے اور یہ کام صرف ہم لوگ ہی کر سکتے ہیں یعنی نئی نسل یہ مسئلہ سماجی طور پر تو حل ہو بھی سکتا ہے۔ قانون ابھی اس کو مکمل طریقہ سے ختم کرنے میں کامیاب نہیں ہوگا۔ لوگ چوری چھپے ایسے کام کریں گے نئے نئے طریقے سوچیں گے دینے کے۔ تو ایسی بات ہے۔ بھئی مجھے ہی افسوس ہوا تمہارے حالات جان کر۔ کاش تمہیں اتنی سمجھ ہوتی کہ تم بگڑے ہوئے حالات کو سنبھال سکتے اور اُس مظلوم کے ساتھ اپنی زندگی بھی ویران ہونے سے بچا لیتے۔ پھر اب سر کیوں جھکائے بیٹھے ہو"

اجے نے ایک کچوکہ اور لگاتے ہوئے کہا۔

"اب غم کا ہے کا خوشی مناؤ کہ کانٹا نکل گیا۔ اب منہ بسورنے کی کیا ضرورت باقی رہ گئی"

"خوشی؟ ہاں بھئی تم تو یہی کہو گے خوشی ہی ہوتی ہے ایسی باتوں سے؟ جب آدمی پر کوئی مشکل آتی ہے تو دوسرے ایسے ہی کہا کرتے ہیں"
پرکاش نے جو بہت زیادہ بیزار نظر آ رہا تھا اور نادِم بھی، ہلکی آواز میں کہا۔

"میں تو خود ہی کہہ رہا ہوں کہ بہت زیادتی ہوئی اس کے ساتھ۔ بس ذرا سے صبر اور برداشت سے بات یہاں تک نہ پہونچتی ..."

"ارے پھر وہی۔ تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟" اجے نے فوراً اسکی بات کاٹ دی میرے اتنی دیر تک سر کھپانے سے ایک وقت کو اگر جانور بھی ہوتا تو قائل ہو جاتا مگر تم وہیں کے وہیں رہے۔ ارے صبر ہی کر کر کے تو اُس نے اپنی جان پر بنالی۔ کتنا صبر کرتی کب تک کرتی اور کس کے بھروسے پر کرتی کوئی میعاد مقرر تھی کب تمہارے اندر ہمت پیدا ہو گی اور کب تم انسان بن جاؤ گے۔

"تم تو بس ایک ہی بڑ ہانکے جا رہے ہو" پرکاش کے چہرے پر سخت ناگواری پیدا ہو گئی تھی۔ "آگے کے لئے کوئی راہ بتاؤ بتانی ہے تو۔"

"راہ کیا بتانی ہے۔ راہ تو بس ایک ہی ہے۔ سیدھی طرح سسرال جاؤ معافی مانگو اور آئندہ کے لئے مرد بن جانے کا وعدہ کرو اور بس۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ چوڑیاں پہنو اور گھر میں بیٹھے غم مناتے رہو چوڑیوں کا ایک بہت ہی خوبصورت سا سیٹ میں لاکر پہنا دوں کہو تو۔"

"ہٹاؤ بھئی ان بیکار باتوں سے کیا فائدہ ہے" پرکاش نے پھر منہ بنایا میرا مطلب یہ ہے کہ معاملہ بہت آگے پہونچ گیا ہے۔ اُس کا بھائی کہہ گیا ہے کہ اب وہ کسی حالت میں بھی اپنی بہن کو یہاں نہیں بھیجے گا۔ اِدھر یہاں والے بھی اُس کو خوشی سے بلانے پر راضی نہ ہوں گے آخر بات بنے تو کیسے بنے ایسے حالات میں میرا وہاں جانا.... مطلب یہ کہ وہ لوگ مجھے...." وہ ہکلا کر رہ گیا۔

"ماریں گے...." اجے نے مُسکرا کر کہا۔

"نہیں بھائی تم جی نہ جلاؤ میرا" میں کہنا چاہتا تھا کہ۔ کہ مشکل ہی ہے۔"

"بس تو پھر ماں باپ کے پیروں میں دبکے بیٹھے رہو اور اپنے کو برباد کرتے رہو بیوی کی ضرورت ہی کیا ہے۔ یا پھر اُن کی مرضی کی کوئی دوسری لڑکی دیکھ لو اُن کی خوشی تو اسی طرح پوری ہو سکتی ہے۔ لیکن اتنا یاد رکھنا دوست

کہ مظلوم کا صبر کبھی رائگاں نہیں جاتا۔ بیوی تو تم کو بل جائے گی دوسری لیکن وہ تمہارے لئے عذاب ہی نہ بن کر رہ جائے۔ بہرحال سوچ لو میرے بھیّا بھگوان تمہاری سہائتا کریں"۔ اجے ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ اُٹھا اور ایک طرف کو چل دیا۔ پرکاش نے اس کے گہرے طنز میں بجھے تیر کو اپنے سینے میں پیوست ہوتے ہوئے محسوس کیا اور سر جھکا کر پھر کسی سوچ میں گُم ہو گیا۔

"آؤ دیدی۔ کیا بہت تھک گئیں؟"

رکشا سے اُتر کر کوٹھی کے گیٹ میں داخل ہوتے ہوئے اویناش نے پیچھے گھوم کر موہنی سے کہا جو دھیمے دھیمے قدم اُٹھاتی لڑکھڑاتی تھکن سے چور ساڑی کے پلوّ سے پسینہ پونچھتی چلی آ رہی تھی۔ اٹیچی کیس اور ہولڈال کو اُس نے وہیں برآمدے میں چھوڑا اور دونوں ہاتھوں سے اُس کے کندھے پکڑ کر اپنے سہارے سے اُس کو سیڑھیاں پار کراتے ہوئے شامو کو آوازیں دینے لگا۔ شامو تو کہیں نظر نہیں آیا لیکن اُسکی آواز پر اُس کی ماں بڑی بے قراری سے اُن کی طرف لپکتی ہوئی نظر آئیں اور اُس کے ساتھ موہنی کو دیکھ کر خوشی سے اسکو اپنے ساتھ بھینچتی ہوئی اویناش سے بولیں۔

"بہت دن لگا دیئے بیٹیا اور کوئی چھٹی بھی نہیں لکھی۔ یہی تو عادت خراب تیری۔" اور پھر موہنی کو علیحدہ کرتے ہوئے اُس کو بغور دیکھتے ہوئے بڑی حیرت سے انہوں نے کہا۔

یہ اسکو کیا ہوگیا؟ یہ تو بالکل ہی بدل گئی کیا بہت بیمار ہوگئی تھی؟" اور اُس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر پھر اُس کو گلے لگاتے ہوئے خود بھی رو پڑیں میری بچی بھگوان تجھے سُکھ دیں۔

"ارے ماں! ان کو اندر لٹا دو۔ ان کی طبیعت خراب ہے اس طرح

ہلکان تو نہ کرو۔" اور پھر خود ہی پکڑ کر اُس کو اندر لے گیا اور بستر پر لٹا کر باہر آیا اور سامان اُٹھا کر دوسرے کمرہ میں لے جاتے ہوئے ماں کو اپنے پیچھے آنیکا اشارہ کیا اور جب وہ کمرہ میں آگئیں تو صوفے پر لیٹتے ہوئے بولا۔

"تمہیں کیا معلوم ماں کہ اتنے دن میں ان لوگوں پر کیا کیا گذر گیا۔"

"کیا ہوا؟" ماں نے بے چینی سے اُس کے پاس ہی بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"ہوتا کیا مصیبت کا ایک پہاڑ ٹوٹ گیا اِن کے اوپر۔ پہلے تو اُن کی ماں مریں پھر ستیش بھیّا بھی اِن سے منہ موڑ گئے۔"

"ہائیں کیا کہہ رہا ہے تو؟"

"سچ ہی کہہ رہا ہوں ماں۔ آفس سے آتے ہوئے ایک ٹرک سے اُن کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا اور ہاسپٹل لے جاتے لے جاتے وہ بھگوان کو پیارے ہو گئے۔"

"ہائے رام! وہ اپنے ماتھے پر ہاتھ مار کر چلاّ اُٹھیں۔ یہ تو بڑا غضب ہوا ہائے موہنی اتنی سی جان پر اتنے بڑے دُکھ کیسے سہے تو نے۔"

اور یکایک ان کو وہاں سے اُٹھتے دیکھ کر اوِیناش اُچھلا اور اُنکا ہاتھ پکڑ کر بٹھاتے ہوئے بولا۔

"ابھی کچھ نہ بولنا دیدی کے سامنے ان کو پہلے تھوڑا آرام کرنے دو۔"

اور ناچار وہ وہیں بیٹھ کر آنسو بہانے لگیں اور تھوڑی دیر بعد کچھ بڑبڑانے بھی لگتیں۔ اوِیناش بھی کچھ دیر صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کئے خاموش بیٹھا رہا پھر کچھ سوچ کر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا۔

"بھائی صاحب نہیں آئے ابھی تک اور پنکو تو ٹھیک ہے؟"

"سریندر تو کل سے دہلی گئے ہوئے ہیں کسی کام سے۔ اور پنکی ٹھیک ہے بس آتی ہی ہو گی اسکول سے۔" اُس کی ماں نے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا۔

"بس اب جاؤ دیدی کے پاس اور اُن کو کچھ چائے وائے پلواؤ لیکن اُن کے سامنے کوئی بھی ایسی بات نہ کرنا جس سے ان کو دُکھ ہو۔ آ نہیں رہی تھیں میں بڑی مشکل سے لایا ہوں کہ دِل بھی بہلے گا اور علاج بھی ٹھیک سے ہو جائے گا دوا بھی وقت پر نہیں لیتیں اس کے لئے بھی زبردستی کرنی ہو گی۔"

"وہ میں سب کر لوں گی" ماں نے کہا۔ "جانے کس طرح اتنے دُکھ اُٹھالئے اِس غریب نے اُس کے لئے تو پہلے ہی کیا کم دُکھ تھے۔"

"اور ہاں!" وہ کچھ یاد آتے ہی جاتے جاتے پھر بیٹھ گئیں۔ "وہ دلنود نے چندوسی سے کچھ پیسے بھیجے تھے منی آرڈر تمہارے نام تھا وہ تو آتا ہی تمہارے نام سے ہے تو اس بار سریندر نے اُس کو وصول کر لیا اور پیسے بھی مجھے نہیں دیئے اور تین دن سے برابر یہی بحث کر رہے ہیں کہ آپ یہاں رہ کر اپنا کھانا خرچہ الگ کیوں رکھتی ہیں۔ وہ تو کسی بات کو مانتے نہیں پر میں کس طرح بیٹی کے گھر کا کھاؤں اور دلماد سے اپنا خرچہ اُٹھواؤں وہ تو مجبوری کی بات تھی اور بچی کا دھیان تھا جو میں یہاں آ گئی ورنہ کہیں بیٹی کے گھر پر ماں رہ سکتی ہے آخر۔ میں نے سوچا بچی بن ماں کے تو ہو ہی گئی ہے اگر میں اس کو اپنے پاس بُلا لُونگی تو وہ باپ سے بھی چھوٹ جائے گی پر مجھے کیا پتہ تھا کہ سریندر اتنی سختی پر اتر آئیں گے ابتک تو منہ سے ہی کہا کرتے تھے لیکن کچھ دنوں سے رسوئی میں پہونچ کر چیک کرتے ہیں ایک ایک چیز کو اور روٹھ جاتے ہیں۔"

"پھر کیا ہونا چاہئے؟" اوِیناش نے سوچتے ہوئے کہا۔ "چلو تو پھر چھوڑو اور کیا ہو گا وہ پیسے جو آئے ہیں وہ اُن سے مت لینا۔"

"نہیں بیٹا یہ نہیں ہو سکتا۔ میرے مُنہ میں اُن کے گھر کا کھانا چلے گا کیسے؟"

"تو پھر کر لینا اُن سے بات خود ہی۔ میں کیا جانوں۔ اسوقت چھوڑ دو اس قصّے کو اور ان کے پاس تو جاؤ۔"

"ہاں ہاں جاتی ہوں" کہہ کر وہ اٹھیں اور دبے قدموں سے جا کر انہوں نے اندر کمرہ میں جھانکا پھر آہستہ سے اُس کے پاس کے جا کر کھڑی ہو گئیں۔ آہٹ پا کر موہنی نے آنکھیں کھولیں اور انہیں پاس کھڑا ہوا دیکھ کر اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ اُس کے پاس ہی بیٹھ گئیں اور اُس کے سر پہ ہاتھ رکھ کر بڑے پیار سے کہا۔

"جاگ رہی ہو بیٹی، میں سمجھی آنکھ لگ گئی ہے۔ اچھا تو پھر اُٹھو ہاتھ منہ دھولو۔ میں چائے اور تھوڑا سا ناشتہ لاتی ہوں"۔ وہ اتنا ہی کہہ پائی تھیں کہ پنکی نانی نانی کہتی ہوئی دوڑ کر اُن کے پاس آ گئی اور کچھ دیر حیرت سے موہنی کی طرف دیکھتی اور اُس کو پہچاننے کی کوشش کرتی ہوئی بولی۔

"یہ کون ہیں نانی؟"

"یہ آنٹی ہیں تمہاری بیٹا"۔

"آنٹی؟ نہیں تو"۔ اور نانی کے اِس کمرہ میں سامنے ہی لگے ماں کے فوٹو کو غور سے دیکھ کر اور پھر موہنی کو دیکھ کر آہستہ سے بولی۔

"لیکن ان کی صورت تو ممّی جیسی ہے بالکل۔ اُوں آپ بہکا رہی ہیں ممّی کو، میری ممّی کو آنٹی بتا رہی ہیں۔ بھگوان نے اُن کو بھیج دیا ہے ہمارے گھر وہ جیسے کھِل اُٹھی اور بڑھ کر موہنی کے گلے میں ہاتھ ڈال کر بولی۔ اب میں کبھی نہیں جانے دوں گی بھگوان کے پاس"۔

"آپ کیوں چلی گئی تھیں وہاں۔ بتائیے اب تو نہیں جائیں گی مجھے چھوڑ کر بتائیے نا ممّی؟ اب اگر آپ گئیں تو میں بہت رؤں گی۔ نہیں جائینگی نا؟"

"نہیں"۔ موہنی نے سر ہلا دیا اور بے ساختہ اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے جن کو اُس نے فوراً ہی صاف کیا اور اُس کا پیارا سا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے کر اُس کی پیشانی چومتے ہوئے بولی۔

"لیکن ایک شرط ہے۔"

"وہ کیا ہے ممّی؟"

"وہ یہ ہے کہ تم ہمیں آنٹی کہو گی ممّی نہیں۔"

"اچھا۔ اچھا میں آپ کو آنٹی ہی کہوں گی۔ ممّی کبھی نہیں کہوں گی۔ آپ اگر یہیں رہیں گی تو جو آپ کہیں گی میں وہی کروں گی۔" اُس نے پیار سے اپنا سر موہنی کی گود میں رکھتے ہوئے کہا۔ اور کچھ دیر بعد اچانک ہی کچھ یاد کرتے سر اُٹھا کر نانی سے بولی۔

"پپّا ابھی تک نہیں آئے نانی! کتنے جھوٹے ہیں۔ کہتے تھے بہت جلد آجاؤں گا۔"

"آجائیں گے بیٹی رات تک ضرور آجائیں گے اور سُنو پنکو تم آنٹی کو لے جا ہاتھ منہ دُھلواؤ اور باتیں کرو اِن سے۔ میں چائے لے آؤں۔"

"شامو۔ ارے او شامو۔ پکارتی ہوئی وہ اُٹھیں۔

"شامو تو مجھے یہاں چھوڑ کر بازار گیا ہے نانی! ماما نے بھیجا ہے اُسکو۔"

"اور ینا ش کہاں ہے ماں جی۔" موہنی نے وہیں سے جھانکتے ہوئے کہا۔

"دیکھتی ہوں شائد نہانے چلا گیا ہے۔ کیوں کیا کام تھا؟" انہوں نے بڑے پیار سے پوچھا۔

"جی سوٹ کیس کی چابی لینی تھی۔"

"اچھا" وہ اُٹھ کر باہر چلی گئیں اور پنکی کو بھی اسکول کے کپڑے بدلوانے کے لئے ساتھ ہی لے گئیں۔

موہنی پھر لیٹ گئی اور سوچنے لگی اب کیا ہو گا۔ ڈاکٹر کے آنے کا وقت قریب آرہا ہے۔ میں کس طرح اُن کا سامنا کروں گی۔ وہ اچانک ہی اپنے گھر میں مجھے دیکھ کر کیا سوچیں گے کس طرح کے خیالات اُس وقت اُن کے ذہن میں آئیں گے اور سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ وہ میرا علاج شروع کریں گے اور نہ جانے

کیا کیا ہوگا وہ بُری طرح چکرا گئی۔ ہے بھگوان تو ہی میری سہائتا کرنا۔ کچھ ایسا ہو کہ وہ مجھ سے دُور دُور ہی رہیں ورنہ میں کیا کروں گی اسی طرح کے خیالوں میں گم وہ کروٹ لئے لیٹی تھی کہ اویناش تولیہ سے بالوں کو رگڑتا پنکی کو ساتھ لئے ہوئے کمرہ میں داخل ہوا۔

"ارے دیدی اٹھو تو۔ منہ ہاتھ دھو کر یہ کپڑے تو بدل ڈالو۔ پسینے میں سب خراب ہو گئے ہیں اور یہ سوٹ کیس کی چابی۔" اُس نے وہیں سے چابی اُس کی طرف اُچھال دی۔

"آئیے آنٹی میں لے کر چلتی ہوں آپ کو۔" اُس نے موہنی کا ہاتھ پکڑ لیا اور اُس کے ساتھ چلتی ہوئی باہر آ گئی اور آگے بڑھ کر باتھ روم کا دروازہ کھول کر خود باہر کھڑی ہو گئی اور باتیں شروع کر دیں۔

"آنٹی پپّا بہت سے کھلونے لے کر آئیں گے میرے لئے۔ میرے پپّا تو اتنے اچھّے ہیں کہ کسی کے بھی نہیں ہوں گے۔ سب کے پپّا ڈانٹتے ہیں بچّوں کو مگر وہ تو مجھے کچھ بھی نہیں کہتے۔"

"اری پنکی تم نے بھی منہ ہاتھ دھویا یا نہیں لاؤ میں دُھلا دوں۔"

"نہیں نانی نے دُھلا دیا ہے۔ آپ سے پھر دُھلوایا کروں گی ابھی تو آپ تھک رہی ہیں۔ اور اب تو میں خود ہی دُھو سکتی ہوں دیکھئے کتنی بڑی تو ہو گئی ہیں۔"

"ارے آپ کا منہ تو دُھل کر کتنا گورا ہو گیا۔ کیا بہت صابُن لگاتی ہیں آپ؟" پنکی کی پیاری پیاری باتوں سے موہنی کو اپنا دِل کچھ بہلتا ہوا معلوم ہوا اس کے علاوہ یہاں کا ماحول، کھُلی ہوا۔ کھُلے کھُلے روشن اور صاف ستھرے کمرے ماربل کے فرش اور ٹائلز جا بجا لگے ہوئے اوپر سے خوبصورت پھولدار پردے اور دوسری سجاوٹ کی چیزیں۔ اُدھر باغ کی طرف کھُلنے والی کھڑکیوں اور گلدستوں سے ہوا کے ساتھ سرسراتی ہوئی مہک جو دماغ میں سکون اور ٹھنڈک بھر دیتی تھی۔ یہ سب بھی اُسے اچھّا لگ رہا تھا۔ بس وہ تو ڈاکٹر کے

آنے کے خیال سے سہمی جا رہی تھی۔ منہ ہاتھ دھو کر اُس نے ہری پھولدار ساڑی پہنی اور بِنکی کے ساتھ اُس کمرہ میں آگئی جہاں سنگار میز رکھی ہوئی تھی وہاں سے کنگھا اُٹھا کر وہ اپنے بالوں میں پھیر ہی رہی تھی کہ ماں کی آواز آئی۔

"موہنی آجا بیٹی چائے پی لے۔"

"آئی ماں جی۔ اُس کی مہین رسیلی آواز کمرے میں گونجی تو اُسے عجیب سا لگا اور کنگھا رکھ کر بِنکی کا ہاتھ تھامے ہوئے وہ ماں کے پاس چلی آئی ماں نے غور سے اُسے سر سے پیر تک دیکھا اور مسکراتی ہوئی بولیں۔

"کتنی کومل کتنی پیاری ہے میری بیٹی جیسے چمبیلی کی کلی۔ میری نظر نہ لگ جائے کہیں۔"

"ہٹائیے بھی ماں جی۔" شرما کر اُس نے اپنا سر جھکا لیا اور دِل ہی دِل میں کہہ اُٹھی "لیکن بھاگ تو اچھے نہیں ہیں میرے ماں" اور اُداسی پھر اُس کی آنکھوں میں تیر آئی۔ چائے پیتے ہوئے اوِناش نے اُس کی آنکھوں میں دیکھا اور بناوٹی غصہ سے بڑبڑایا۔

"پھر وہی رونی صورت بنانی شروع کر دی۔ یہاں آکر تمہیں اچھا نہیں لگا کیا؟ ہم اتنے برے ہیں؟"

"نہیں تو کہاں بنا رہی ہوں رونی صورت میں۔ یہ تم کیسی باتیں کرنے لگتے ہو۔"

"صورت نہ سہی آنکھیں تو رونی سی بنا رہی ہو۔"

"تمہیں تو وہم رہتا ہے ہر دم۔ لو اچھا چائے اور لو۔ باتیں کم ہی کیا کرو ذرا۔" اُس نے ایک کپ اور بنا کر اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"بہت اچھا! بلکہ بولنا بالکل ہی چھوڑ دوں تو زیادہ اچھا رہے گا۔"

"ہوں۔ ہوں۔ پھر لگے اکڑنے۔" موہنی نے چائے کا گھونٹ نگلتے ہوئے کہا۔ "کان کھینچ کر رکھ دوں گی۔ ہاں۔ سمجھتے کیا ہو اپنے کو۔"

ماں دونوں کو ہنستے کھیلتے دیکھ کر خود بھی کھلی جا رہی تھی۔ کنو بھی تو بالکل اسی طرح پیار بھری نوک جھونک ہر دم رکھتی تھی اویناش کے ساتھ دونوں بہن بھائی جب ایک جگہ ہوتے تھے تو کھاتے پیتے اُٹھتے بیٹھتے بس ایسے ہی لڑا کرتے تھے۔ اُن کو لگا جیسے کملیش آج واقعی لوٹ آئی ہے اُن کے پاس اور اسی خوشی اور غم کے ملے جلے جذبے کے تحت ان کی آنکھیں بھر آئیں جن کو وہ آنچل سے رگڑ رہی تھیں۔

"ماں! میں تو چلا۔" اویناش فوراً آدھی پیالی میز پر چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

"کیا ہے اویناش تم تو بات بات پر روٹھتے ہو، بیٹھو سیدھی طرح۔" موہنی نے پکڑ کر پھر اُس کو بٹھاتے ہوئے کہا۔

"ارے یہ تو خوشی کے آنسو ہیں پگلے۔" ماں روتے میں ہی مسکرا دی۔

"غم میں رونا خوشی میں رونا۔ آنے پر رونا جانے پر رونا۔ بس رونا ہی رونا رہتا ہے آپ لوگوں کو۔ غم میں تو ہر کوئی روتا ہے لیکن خوشی میں بھی خوش ہونے کی بجائے روتی ہیں آپ لوگ۔ جیسے زندگی صرف رونے کے لئے ہی ہے۔"

"ارے تو کیا جانے اِن باتوں کو۔"

"جانتا ہوں میں سب کچھ ماں لیکن اِس وقت تو رونے کی کوئی بات نہیں تھی۔"

"اچھا اب چپ ہو جاؤ اویناش اور کوئی دوسری بات کرو۔" موہنی نے اُس کو آہستہ سے ڈانٹا اور اس کے بعد پھر وہ کچھ نہیں بولا۔ خاموشی سے چائے پی اور اپنے کمرہ میں تھوڑی دیر آرام کرنے چلا گیا۔ اور ماں کھانے کے انتظام کے سلسلے میں رسوئی کی طرف چلی گئیں۔ موہنی بھی اُٹھی اور اُس کمرہ میں چلی گئی جہاں ماں نے اُس کا بستر لگوا دیا تھا اور اُس کا سامان بھی قرینے سے رکھوا دیا تھا اور اویناش نے پہلے ہی اس میں صفائی وغیرہ کروا کر شامو سے تازہ تازہ پھولوں کے گلدستے میز پر رکھنے کی ہدائت کر دی تھی۔ اُس کمرہ کی

ایک کھڑکی باغیچے کی طرف کھلتی تھی جس میں طرح طرح کے پھل دار درخت اور نہ جانے کتنی طرح کے پھول پودے اور ترکاریاں لگی ہوئی تھیں۔ کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر موہنی لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ اُدھر سے آنے والی ٹھنڈی ہوا نے جس میں کھڑکی کے قریب ہی لگے ہوئے چمبیلی کے پھولوں کی خوشبو بھی ملی ہوئی تھی اُس کے دماغ کو ایکدم ہی تازہ کر دیا۔ اِس وقت وہ خود کو بہت ہی ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی کچھ دیر بعد شامو پھولوں کے گلدستے لیکر آگیا اور گلُ دانوں کو صاف کر کے وہ پھول اُن میں لگا دیئے پنکی بھی اُس کے پیچھے کمرہ میں آگئی تھی اور پھولوں کو دیکھ دیکھ کر اور سونگھ سونگھ کر خوش ہو رہی تھی۔ موہنی کو کھڑکی کے پاس کھڑا دیکھ کر وہ بھی اُس کے پاس آگئی اور اپنی تیز اور پیاری سی آواز میں بولی۔

"آنٹی کیا دیکھ رہی ہیں؟ پھول پودے؟ یہ سب پپّا نے بڑی دُور دُور سے لاکر یہاں لگائے ہیں۔ کتنے ہی رنگ کے گلاب ہیں دیکھئے۔ مگر اب تو اندھیرا ہونے لگا ہے صبح کو دیکھئے گا اور آنٹی! پپّا روز دو گلاب کے پھول میرے بالوں میں لگاتے ہیں اور سب طرح کے پھولوں کے ہار بنوا کر مجھے اپنے ہاتھ سے پہناتے ہیں۔ مجھے پھول بہت اچھے لگتے ہیں۔"

"اچھّا۔" موہنی نے پیار سے اُس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"ہاں آنٹی!" وہ خوش ہو کر بولی۔

"آپ بھی لگوایا کریں گی نا پھول اپنے بالوں میں؟ پپّا لگا دیا کرینگے آپ کے بھی۔" اور کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد اُس نے عجیب سے سوال شروع کر دیئے۔

"آپ کے پپّا آپ کے پھول نہیں لگاتے کیا؟ کہاں ہیں آپ کے پپّا آنٹی اور آپ کی ممّی؟ اُن کو یہاں کیوں نہیں لیکر آئیں آپ۔" اور اُس کے بعد وہ نہ جانے کیا کیا بولتی رہی موہنی نے کچھ نہیں سُنا وہ نہ جانے کن خیالوں میں کھو

گئی اور بعد آہستہ سے اپنے بستر پر آئی اور دونوں ہاتھ سر پر رکھے رکھے ہی لیٹ گئی۔ کچھ دیر اُس کا پورا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا پنکی پھولوں کی طرف متوجہ ہو گئی تھی اور جب وہ کچھ کہنے کے لئے پلٹی تو حیرت سے چلا اُٹھی۔

"ارے آنٹی رونے کیوں لگیں ؟ کیا ہو گیا ؟"

"کچھ نہیں ہوا پنکی جاؤ تم باہر کھیلو جا کر ۔"

"نہیں پہلے بتائیے روئیں کیوں۔ بتائیے نا آنٹی ۔" وہ بے چین ہو کر اُس سے لپٹ گئی تھی کہ اتنے میں موٹر کے ہارن کی آواز سُن کر دونوں ہی چونک پڑیں۔ پپّا آ گئے پنکی زور سے اُچھلی اور باہر دوڑی چلی گئی۔ پپّا آ گئے پپّا آ گئے اُسکی آواز دیر تک گونجتی رہی اور موہنی بدحواس ہو کر پہلے اُٹھ کر بیٹھی اور پھر لیٹ گئی اور چادر سے منہ بھی ڈھانپ لیا۔

ڈاکٹر بڑے کمرہ میں داخل ہوا اور اپنا بریف کیس میز پر رکھ ہی رہا تھا کہ پنکی آ کر اُس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔

"پپّا آپ نے اتنی دیر کیوں لگائی ۔" اُس نے ٹھنکتے ہوئے کہا۔ اور میرے لئے "کچھ بھی لیکر نہیں آئے کیا ۔"

"لایا ہوں بھئی یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ میں اپنی بٹیا کے لئے تو بہت سی چیزیں لایا ہوں ۔" ڈاکٹر نے اُس کو بڑے پیار سے اُٹھا کر گود میں لے لیا اور ساتھ ہی وہیں کھڑے شاہو سے گاڑی میں سے کنڈی نکال کر لانے کے لئے زور سے کہا۔ اور پھر اوینا شں کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔

"ارے تم آ گئے۔ بڑے دن لگا دیئے وہاں ۔" بیٹھتے ہوئے غور سے اُس کے چہرے کی طرف دیکھ کر کہا۔

"کچھ سست نظر آ رہے ہو کیا چکر ہے ؟ وہ سب لوگ ٹھیک ٹھاک تو ہیں نا ؟" اوینا شں کے کچھ کہنے سے پہلے پنکی زور سے چلّائی۔

"ارے ہاں پپّا میں تو بھول ہی گئی۔ اُدھر نانی کے پاس والے

کمرہ میں چل کر دیکھئے کون آیا ہے ہمارے یہاں۔"
"کون ہے؟" اُنھوں نے اپنی ساس کی طرف سر گھما کر دیکھا۔
"موہنی ہے بیٹا!"
"اچھا۔ کیسے آگئیں؟" اُس نے حیرت سے کہا اور پنکی کو گود سے اتار کر کرسی پر بیٹھ گیا۔
"وہ بیمار ہے کچھ۔ اویناش اُس کو اپنے ساتھ ہی لے آیا ہے۔ تم منہ ہاتھ تو دھو لو۔"
"جاتا ہوں۔" کہہ کر وہ اُٹھ کر باہر چلا گیا۔
اور جب چائے آگئی اور ماں نے اویناش سے موہنی کو بھی چائے لے جا کر پلانے کی بات کی تو پنکی کچھ یاد کرتے ہوئے بولی۔
"ارے آنٹی کیسے چائے پئیں گی وہ تو رو رہی تھیں۔ ماما پہلے اُنکو جاکر چپ کرا لونا۔"
"کیوں۔ رو کیوں رہی تھیں؟" ڈاکٹر نے پنکی کو دیکھتے ہوئے کہا۔
"تم چائے تو پیو بیٹا۔ سب معلوم ہو جائے گا۔ اُن لوگوں پر تو بڑی بھاری بپتا پڑی ہے۔ کیا ٹھکانہ ہے۔" ماں نے بڑے غم کے ساتھ کہا۔
"کیوں کیا ہوا؟" ڈاکٹر نے خالی پیالی میز پر رکھ کر اُن کی طرف مڑتے ہوئے پوچھا اور پھر اُن سے پوری بات شروع سے آخر تک سُننے کے بعد وہ کچھ دیر تک تو بالکل خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اُٹھا اور ہلکے ہلکے قدموں سے چلتا ہوا اپنے کمرہ میں جا کر بستر پر لیٹ گیا۔ اُف کتنے افسوس ناک حالات ہیں۔ اُس نے سوچا خاص طور پر ستیش کا حادثہ! اُس کی نگاہوں میں ستیش کا سادگی اور شرافت سے بھرپور سراپا گھوم گیا۔ حالات کی چکّی نے کس بُری طرح پیسا ہے ان بے چاروں کو اور موہنی! کیا حال ہوگا اُس کا۔ وہ یہ سب کس طرح برداشت کر پائے گی۔ کیسے زندہ رہ سکے گی۔ ایک کمزور سی لڑکی۔

وقت کی گرم ہوا کے تھپیڑوں پر اُڑتی ہوئی ایک نازک سی پنکھڑی جس کے احساسات بھی اُسی کی طرح نازک اور کومل ہیں۔ لیکن نہیں۔ وہ نہیں مرے گی۔ اُس کو نہیں مرنا چاہئے ڈاکٹر نے بڑے عزم سے سوچا۔ میں اُسے بچالوں گا جیسے بھی ہو گا۔ میرا اتنے دن کا تجربہ اور میری مہارت آخر کس دن کام آئے گی۔ میری بھرپور ہمدردیاں۔ میرا خلوص اور میری چاہت ممکن ہے اُس کے زخموں کا مرہم بن جائے۔ کافی دیر تک اِسی طرح سوچتے سوچتے اُس کی آنکھ لگ گئی۔ وہ تھوڑی دیر ہی سویا ہو گا کہ پنکی کے ننھے منے ہاتھ کا پیار بھرا لمس محسوس کر کے اُس نے آنکھیں کھول دیں اور اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ اُس کو بلانے کے لئے آئی تھی کہ کھانے پر اس کا انتظار ہو رہا ہے۔ کھانے کی میز پر موہنی کو نہ دیکھ اُس نے اوِیناش سے کہا۔

"اپنی بہن کو نہیں بُلایا۔ وہ کھانا نہیں کھائیں گی کیا؟"

"میں نے بہت کہا کھانے کے لئے مگر وہ کہتی ہیں کہ بھوک نہیں ہے۔ اصل میں درد ہے اُن کے سر میں اور ٹمپریچر بھی ہو گیا ہے کچھ۔"

"تو پھر رہنے دو اور گرم دودھ کے ساتھ یہ گولی کھِلا دینا اُن کو۔"

اُس نے اپنے بریف کیس سے ایک گولی نکال کر اوِیناش کی طرف بڑھائی اور پنکی کے قریب والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ کھانا سب نے ہی خاموشی سے کھایا اور بہت کم۔ ڈاکٹر جو بالکل ہی گم سُم ہو گیا تھا جلدی ہی میز سے اُٹھ گیا اور اُس کے ساتھ باقی سب بھی کھڑے ہو گئے۔

اگلی صبح موہنی اپنے کپڑے ہاتھ میں لئے نہانے کے لئے کمرہ سے نکلی تو اوِیناش بُرا سامنہ بنا کر ساڑی اُس کے ہاتھ سے چھیننے لگا۔

"یہ کیا پہننے جا رہی ہو دیدی۔جب دیکھو ایک سے ایک سڑی لُسی ساڑی پہنے نظر آتی ہو۔چلو مجھے دکھاؤ سوٹ کیس اپنا۔ یہ میں نہیں پہننے دونگا۔"

"اچھی خاصی تو ہے۔اور کیسی پہنوں؟"

"اِس سے تو یہی اچھی ہے جو اُتارنے جا رہی ہو۔کیا یہی ایک اچھی ساڑی لے کر آئی ہو۔ مجھے تو یہ کُمہاروں جیسی سوتی ساڑیاں ذرا نہیں اچھی لگتیں۔ رکھو اِسے۔ اور کوئی سی پہنو نکال کر۔"

"میرے پاس تو سب ایسی ہی ہیں یہاں۔ اچھی لا کر کرتی بھی کیا۔ جی تو چاہتا نہیں کچھ بھی کرنے یا پہننے دہننے کو۔ بس ٹھیک ہی ہے۔ اب تو یہی پہننے دو اوِیناش۔" اُس نے کچھ اُلجھتے ہوئے بڑی خوشامد سے کہا۔

"نہیں کبھی نہیں پہننے دوں گا یہ والی تو۔"

ان دونوں میں جھگڑا ہو ہی رہا تھا کہ اُن کی ماں ہاتھ میں تین ساڑیاں لئے ہوئے آئیں اور موہنی کی طرف بڑھاتے ہوئے نرم سی آواز میں بولیں۔

"ان میں سے کوئی پہن لو بیٹی!"

"یہ سب بہت تیز رنگوں کی ہیں ماں جی! یہ رنگ تو میں نے اب

پہننے چھوڑ ہی دیئے۔"

"کیوں کیا ہو گیا ان کو پہننے میں؟ بوڑھی ہو گئی ہو؟"

"بس یہ سب مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا ماں۔"

"میرے کہنے سے پہن لو بیٹی۔ میرا جی چاہ رہا ہے اسوقت کہ تمہیں ان میں سے کوئی ساڑی پہنے ہوئے دیکھوں۔"

"لیکن یہ ہیں کس کی؟" اُس نے چونک کر پوچھا۔ "آپ کی ہیں؟"

"میں اب بوڑھاپے میں یہ رنگ پہنوں گی؟ یہ کمّو کی ہیں بیٹی۔" بجھی ہوئی سی آواز میں اُنہوں نے کہا۔ "بچی کے پیدا ہونے پر جو ساڑیاں ہمارے یہاں سے آئی تھیں، ان میں سے یہ تین ساڑیاں وہ پہننے کے لئے چندوسی لے گئی تھی لیکن وہاں پہنی ایک بھی نہیں۔ بیماری میں اُس کا جی ہی نہیں چاہتا کچھ پہننے کو۔ یہ ادیناش ہی اُس کو بھی لڑ جھگڑ کر پہناتا اُڑھاتا تھا جب وہاں ہوتی تھی۔"

"کملیش کو کیا ہو گیا تھا ماں۔" بھرّائی ہوئی سی آواز میں موہنی نے پوچھا۔

"کیا بتاؤں بیٹی۔" اُنہوں نے ٹھنڈا سانس لیکر کھوئی کھوئی آواز میں کہنا شروع کیا۔ "اُس کے معدہ میں بہت درد ہوتا تھا۔ جو کھاتی تھی الٹ دیتی تھی۔ ڈاکٹروں کی سب کی ایک ہی رائے تھی کہ معدہ کا منہ سُکڑ گیا ہے۔ آپریشن کرانا ہوگا لیکن وہ آپریشن سے بہت ڈرتی تھی۔ سریندر طرح طرح سے اُسکو سمجھاتے تھے لیکن وہ سُنتی ہی نہ تھی۔ ایک بار سریندر کے بہت کہنے سُننے اور قسم دینے پر خاموش ہو گئی تھی کہ فوراً ہی میرے بھتیجے کی شادی کا خط آ گیا اور اُس کو ٹالنے کا بہانہ مل گیا۔ خط کو دیکھتے ہی وہ چندوسی پہونچ گئی کہ وہاں سے واپس آنے کے بعد آپریشن ہو جائے گا اور وہیں پر ایک دن حالت اُس کی خراب ہو گئی۔" وہ کچھ دیر کے لئے رُک گئیں پھر بولیں۔

"مجھے اگر معلوم ہوتا کہ ایسی بات ہے تو میں کبھی اُس کو شادی کی خبر نہ

بھیجنے دیتی مگر ہوتا وہی ہے جو اوپر والا چاہتا ہے۔"
"پھر کیا ہوا؟" موہنی نے پوچھا۔
"پھر کیا ہوتا۔ یہاں تار بھیجا۔ سریندر فوراً ہی بھاگے بھاگے گئے۔ کافی دوڑ دھوپ کی لیکن بے کار۔ اُن کے جانے کے اگلے دن ہی۔۔۔"
اِس سے آگے وہ نہ بول سکیں اور لاکھ ضبط کرنے کے باوجود دونوں ہاتھوں میں مُنہ چھُپا کر رو پڑیں۔ موہنی بھی وہیں صوفے پر بیٹھی بیٹھی ساڑی کے آنچل میں مُنہ چھُپا کر رونے لگی اور جب اُس کی سسکیاں تیز ہوگئیں تو ماں نے سر اُٹھا کر دیکھا اور اپنے آنسو پونچھتی ہوئی اُس کے پاس آکر کھڑی ہوگئیں اُس کا سر آہستہ سے تھپتھپاتے ہوئے بولیں۔
"تو نہ رو بیٹی۔ تیرا جی ویسے ہی اچھا نہیں ہے" اور وہیں سے اوناش کو آوازیں دینے لگیں جو باہر کھڑا آنسو بہا رہا تھا۔ اِن ساڑیوں کو دیکھ کر اُس کو بہن کی یاد آگئی تھی۔ یہ ساڑیاں وہ اپنی پسند سے اور بڑے چاؤ سے خود ہی خرید کر لایا تھا۔ ماں کی آواز پر وہ اندر آیا اور تھوڑی دیر موہنی کے پاس خاموشی سے بیٹھے رہنے کے بعد اُس سے بولا۔
"تم مت رویا کرو دیدی۔ رات رونے سے ہی تم کو بخار ہوگیا تھا چلو اب نہا لو جاکر۔" اور کھڑے ہوکر ایک ساڑی ماں کے پاس سے اُٹھا کر موہنی کے ہاتھ میں دیتے ہوئے بولا۔
"یہ والی ساڑی پہنو آج۔"
"نہیں نہیں۔ یہ نہیں۔"
"کیوں کیا ہرج ہے اسکو پہننے میں؟"
"ہرج تو کچھ نہیں۔ لیکن وہ.... بات ایسی ہے اوناش کہ.... یہ.... کچھ ٹھیک نہیں..." وہ بڑی طرح ہکلانے لگی۔
"اوفوہ! آخر بتاؤ تو کیا بات ہے۔ کس لئے ہچکچا رہی ہو اتنا؟"

"تم نہیں سمجھ سکو گے اوینا شں۔ ایسا ہے کہ.... کملیش نے شائد پہنا ہو کبھی اِس ساڑی کو اور.... اور...."

"اوہ تو یہ مطلب ہے۔ لیکن یہ پہنی ہوئی لگتی تو نہیں ہے ورنہ ہم خود ہی تمہیں پہننے کے لئے نہ کہتے"

"نہیں۔ اس نے نہیں پر زور دیتے ہوئے کہا۔ یہ بات نہیں ہے۔

اُفوہ! یہ کیا سمجھ بیٹھے تم اوینا شں اُس کی ہزار دفعہ کی پہنی ہوئی ہوتی جب بھی مجھے ذرا اعتراض نہیں ہو سکتا تھا۔ میرا مطلب تو یہ تھا کہ.... کہ تمہارے بھائی صاحب سوچیں گے..... نہیں نہیں میں۔ میرا.... اونہہ" وہ اُس کو سمجھا نہ سکی۔

"ارے نہیں وہ کیا سوچیں گے۔ اُن کو یاد بھی نہ ہو گا۔ اتنی فرصت کہاں رکھتی ہے اُن کے پاس اور پہچان بھی لیں تو کیا ہوا۔ تم ان کو کیا سمجھتی ہو دیدی۔ یہ تو ہم ہی جانتے کہ وہ کیا ہیں۔ وہ تو دیوتا ہیں دیدی دیوتا۔ معمولی انسان نہیں"

"ارے بھیا میں تمہیں کیسے سمجھاؤں۔ میری بات تو سنو ذرا...."

"ارے بس چھوڑو" اُس نے موہنی کی بات کاٹ کر کہا "میں کچھ نہیں سُنتا تم تو بے تکی باتیں کرتی ہو ہر وقت۔ دیکھو تمہیں میری قسم اب ایک لفظ نہ بولنا۔ آج تو تمہیں یہی ساڑی پہنی پڑے گی"

اور وہ مجبوری کے عالم میں وہی ساڑی لے کر نہانے چلی گئی وہ اب مطمئن ہو گئی تھی یہ سُن کہ کملیش نے اس کو کبھی پہنا نہیں تھا۔ اس کو فکر تو یہی تھی کہ ایسا نہ ہو کہ ڈاکٹر نے اس کو پہنے دیکھا ہو کبھی تو اُس کی یاد تو اُنہیں آ ہی جائیگی۔ دوسرے مجھے اس کی ساڑی میں دیکھ کر ان کو کوئی اور خیال نہ آجائے اور اتفاق سے وہی ہوا بھی جس کا اسے دھڑکا لگا ہوا تھا۔ وہ اُسی ساڑی کو پہنے ہوئے اور گیلے بال کھولے ہوئے کُرسی پر بیٹھی جُھک کر پنکی کو اسکول کا یونیفارم پہنا رہی

تھی جو اُس نے ماں کو پہناتے دیکھ کر اُن کے ہاتھ سے لے لیا تھا۔ اُس وقت اُس میں اور کملیش میں معمولی ہی سا فرق رہ گیا تھا کیونکہ تھوڑی دیر پہلے اویناش نے اُس کے بہت منع کرنے پر اُس کی سیدھی مانگ بگاڑ کر آڑی مانگ نکال دی تھی جیسی کمّو نکالا کرتی تھی۔ اور موہنی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ آڑی مانگ نکالتی تھی اور بالکل اسی طرح کے بال بناتی تھی۔ اُدھر ڈاکٹر جو صبح سے کسی مریض کو دیکھنے گیا ہوا تھا آیا اور ہسپتال جانے کی جلدی میں گاڑی پھاٹک کے باہر سڑک پر چھوڑ کر ناشتہ کرنے کے لئے تیزی سے برآمدے کی سیڑھیاں پار کر کے جیسے ہی بائیں طرف کو کھانے کے کمرہ میں جانے کے لئے مُڑا، سامنے ہی سائڈ سے بیٹھی کپڑے پہناتی ہوئی موہنی پر اُس کی نظر پڑی۔

"ارے کمل"، بڑی بیقراری کے انداز میں بے ساختہ اُس کے منہ سے نکلا اور قدم وہیں رُک گئے۔ موہنی نے چونک کر نظر اوپر اُٹھائی تو وہ گھبرا گیا اور شرمندگی کے ساتھ بولا۔

"معاف کیجئے گا مجھے اس وقت بڑا دھوکہ ہوا۔ اسی ساڑی میں ایک دن کمل بھی بالکل اِسی طرح نہائی ہوئی بال کھولے ہوئے شائد اپنے کپڑے تہہ کر کے الماری میں لگا رہی تھی جب میں کمرہ میں داخل ہوا تھا"، بڑے کھوئے کھوئے انداز میں بلا ارادہ ہی وہ یہ بات کہہ تو گیا لیکن بعد کو پچھتانے لگا کہ اُسے اِس طرح نہیں کہنا چاہئے تھا اور اُداس چہرے سے ایک بار پھر اُس کو دیکھتے ہوئے ٹھنڈا سانس لیتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ کپڑے پہناتے ہوئے موہنی کے ہاتھ کانپ گئے بدن سنسنانے لگا اور ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ چھوٹنا شروع ہو گیا۔ پچی کو وہیں چھوڑ کر لڑکھڑاتی ہوئی وہ اپنے کمرہ کی طرف جھپٹی اور وہ ساڑی اُتار کر وہی اپنی سوتی ساڑی اچھی طرح باندھ بھی نہ پائی تھی کہ آنکھوں میں اندھیرا سا آیا اور پلنگ پر ڈھیر ہو گئی۔ پنکی جو اُس کے پیچھے پیچھے اپنے بٹن لگوانے آ گئی تھی اُس کو اِس حالت میں پلنگ پر گرتے ہوئے دیکھ کر چیختی ہوئی بھاگی۔

"ماما۔ ماما۔ نانی اِدھر تو آؤ دیکھو آنٹی کو کیا ہو گیا۔"
"کیا ہو گیا۔" اوِیناش تقریباً دوڑتا ہوا آیا۔
"ساڑی بدل رہی تھیں کہ گرنے لگیں بڑی مشکل سے بستر تک پہونچیں اور....."
"ارے۔" اوِیناش گھبرا گیا اور آگے بڑھ کر اُس کے پیر اوپر کر کے آرام سے لٹاتے ہوئے کئی آوازدیں تو اُس نے ذرا آنکھیں کھولیں۔
"کیا ہو گیا تھا دیدی ؟" اُس نے پوچھا۔
"کچھ نہیں چکر آ گیا تھا۔"
"لیکن پسینہ بہت آ رہا ہے ٹھہرو۔ بھائی صاحب کو بلاتا ہوں۔"
"نہیں نہیں اُن کو نہ بلاؤ۔ میں تو ٹھیک ہوں۔ اوِیناش! اُس نے لیٹے لیٹے ہی اُس کا ہاتھ پکڑ لیا لیکن پنکی پہلے ہی باپ سے جا کر سب کچھ بتا چکی تھی۔ ساڑی بدلنے والی بات پر ڈاکٹر بُری طرح چونکا اور ناشتہ بیچ میں ہی چھوڑ کر کچھ سوچتا ہوا پنکی کے ساتھ موہنی کے کمرہ کی طرف چلا گیا۔ دروازے کے پاس جا کر اُس نے اوِیناش کو آواز دی اور پھر دبے قدموں سے اندر داخل ہو گیا۔ نیم بے ہوشی کی حالت میں ایک طرف کو گردن ڈھلکائے ہوئے سیدھی لیٹی ہوئی وہ اُس کو عجیب سی لگی اُس کو پھر اُس پر کملیش کا دھوکہ ہوا پھر اُس کی نظر اُس کی معمولی سی سفید ساڑی پر گئی اور وہ بے چین سا ہو گیا۔ اُس وقت ساڑی کے متعلق بات کر کے اُس نے سخت غلطی کی تھی۔ وہ بہت نازک اور حسّاس لڑکی ہے۔ اُس نے نہ جانے کیا سوچا ہو کس طرح سوچا ہو خیر کسی وقت موقع دیکھ کر اُس کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کروں گا۔ وہ انہیں خیالات میں کھویا خاموش کھڑا تھا کہ پنکی کے قدموں کی آہٹ سے چونکا اور آگے بڑھ کر ایک خالی کرسی پر بیٹھتے ہوئے جو اُسکے پلنگ کے پاس ہی پڑی ہوئی تھی۔ اپنا بریف کیس کھولا اور ایک انجکشن تیار کرنے لگا۔ اور جھک کر جیسے ہی اُس نے اُس کے

بازو پر اسپرٹ کا پھایا لگایا موہنی نے آنکھیں کھول دیں اور پس و پیش کے انداز میں کلبلانے لگی۔

"بس ایک منٹ!" اُس نے بڑی محبّت سے کہا اور دوسرے ہاتھ سے اُس کا بازو پکڑ کر بڑی پھرتی سے انجکشن لگایا اور سیدھا کھڑا ہو گیا پھر سب سامان سمیٹا اور اور ایک نظر اُس پر ڈال کر کمرہ سے نکل گیا۔ اوینا ش نہ جانے کیوں بالکل چپ ہو کر رہ گیا تھا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یکایک یہ ہوا کیا۔ انجانے میں کسی سے کوئی ایسی بات تو نہیں ہو گئی جس سے اُن کو تکلیف پہونچی ہو۔ موہنی سے کچھ بھی پوچھنے کا مطلب تھا اُس کو یاد دلانا اور پریشان کرنا اِس لئے وہ کافی دیر تک اسی اُدھیڑ بن میں خاموش بیٹھا موہنی کے چہرے کو تکتا رہا جو رفتہ رفتہ کچھ پر سکون ہوتا جا رہا تھا۔ سانس بھی معمول پر آرہا تھا۔ اُس نے سوچا کہ کچھ دیر کے لئے باہر جا کر بیٹھ جائے لیکن جیسے ہی وہ کھڑا ہوا موہنی نے آنکھیں کھول کر اُسے دیکھا۔

"کیا ہے دیدی؟ تم ٹھیک ہو نا؟"

"ہاں ٹھیک ہوں۔"

"بس تو ابھی آرام سے لیٹی رہو۔ میں ذرا باہر جاتا ہوں۔ تھوڑی دیر میں آجاؤں گا۔ تمہیں ایک دوا ابھی تو پلانی ہے۔"

"اب کیا ہو گی دوا۔"

"اوہو، دیکھو تم اِس طرح کی باتیں نہ کیا کرو میں نے دس بار کہا ہے تم سے۔" اور وہ باہر برآمدے میں نکل آیا جہاں ماں کھڑی تولیہ سے ہاتھ صاف کر رہی تھی اُسے دیکھتے ہی وہ بولی۔

"کیا ہو گیا تھا موہنی کو؟"

"وہی دورہ پڑ گیا تھا اور کیا ہوتا۔"

"لیکن کیوں؟"

"معلوم نہیں۔ میں خود اسی چکّر میں ہوں۔ اور تم کہاں تھیں؟"

"میں ادھر رسوئی میں تھی۔ بچی نے جا کر بتایا کہ آنٹی کو پسینہ آ رہا ہے اور وہ بستر پر گر گئی ہیں۔ میں فوراً ہی نکل کر آئی تو سریندر کھانے کے کمرہ سے نکل رہے تھے کہنے لگے چائے ٹھنڈی ہو گئی ہے گرم منگوا دیجئے۔ پھر اُن کے لئے چائے لینے چلی گئی۔ چائے پیتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ انجکشن لگا دیا ہے اب بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔ تو اب ٹھیک ہے نا وہ؟"

"ہاں ٹھیک ہیں اب تو۔ بس کچھ دیر ان کو ذرا آرام سے لیٹا رہنے دو۔ کچھ دیر بعد جانا ان کے پاس اور بچی سے بھی کہدو کہ وہ بھی جا کر پریشان نہ کرے۔"

"اچھا کہدوں گی۔ لیکن وہ ہے کہاں؟ ارے ہاں وہ تو اسکول چلی گئی بنا ناشتہ کئے ہوئے۔ میں نے دیکھا بھی نہیں جاتے ہوئے۔ بس چائے ہی پی تھی۔"

دونوں ماں بیٹے وہیں بیٹھ کر باتیں کرتے لگے۔

"میں نے سریندر سے کہا تھا۔ ماں بولی۔

"کیا؟" اِویناش نے سر اُٹھایا۔

"یہی کہ اُس کو اچھی طرح دیکھ بھال کر ایسی دوائیں دو کہ اچھی ہو جائے۔"

"کیا بولے؟"

"کہنے لگے دوا تو میں اچھی سے اچھی دوں گا لیکن کوئی مرض ہو جب نا! غم کی بیماری کا تو ایک ہی علاج ہے اور وہ ہے خوشی۔ من کا چین اور شانتی۔ دوا تو ایسے میں بس سہارے کے لئے ہی ہوتی ہے۔"

"وہ تو ہے ہی۔"

"اور سنو۔ صبح شام اُس کو تھوڑی دُور گھمانے بھی لے جایا کرو۔ سریندر کہہ رہے تھے شام کو اور کہیں بھی نہیں تو باغ میں ہی لے جا کر ٹہلانا اچھا رہے گا تازہ صاف ہوا۔ ہریالی اور پھولوں کی مہک سے بھی اچھا اثر پڑے گا اُس

کے اُوپر۔"

"وہ سب ہو جائے گا۔ اچھا اب چلوں ذرا دوا پلا دوں اُن کو وقت ہو گیا ہے۔"

"میں بھی چلوں؟" ماں نے کہا۔

"تم ابھی رہنے دو۔ یا پھر چلو لیکن زیادہ بولنا نہیں جتنی دیر چُپ چاپ پڑی رہیں گی اچھا ہی ہے۔"

"نہیں۔ میں کیا پاگل ہوں! میں تو اس لئے کہہ رہی تھی کہ وہ یہ نہ سوچے کہ ماں مجھے دیکھنے بھی نہیں آئی۔" اور وہ بھی اُس کے پیچھے پیچھے چلی گئیں۔

اگلے دن شام کو اوینا ش نے پھر ضد کر کے اُس کو سفید شیفون کی ساڑی پہنوائی اور اپنے ساتھ باغ میں لئے چلا آیا اور پورا باغ اُس کو دِکھا کر ایک بنچ پر لا کر بٹھاتا ہوا بولا۔

"لو اب کچھ دیر یہاں بیٹھو۔ کبھی زیادہ گھومنے سے تھک جاؤ۔"

پنکی بھی کسی پہاڑی مینا کی طرح چہچہاتی ہوئی اُس کا ہاتھ پکڑے ہوئے ساتھ ساتھ گھومتی پھر رہی تھی اور خوشی سے دیوانی ہوئی جاتی تھی اُس کے پاس ہی بنچ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"آنٹی اپنے پیچھے تو دیکھئے ذرا۔ پھول ہواؤں کیسے ہولے ہولے جھول رہے ہیں۔ یہاں آ کر اچھا لگا نا؟"

"ہاں بہت اچھا لگا۔" اُس نے پیار سے اُس گود میں لٹاتے ہوئے کہا۔

"ارے نہیں ایسے نہ لٹائیے آپ کی ساڑی خراب ہو جائے گی سفید ہے نا!" اور وہ اچھل کر اُس کے برابر بیٹھ گئی۔ اُس کی اِس بات پر دونوں ہی ہنس دیئے۔

"کتنی سمجھدار ہے ہماری بٹیا۔ اوینا ش نے اُس کو گود میں لیتے

ہوئے کہا وہ پہلے اُس کی گود سے اُترنے کے لئے مچلی پھر سامنے دیکھتے ہوئے بولی۔

"وہ دیکھئے شامو لنگڑا ہو کر چل رہا ہے۔"

"ارے!" ادیناش نے گھوم کر اُس کو دیکھا۔ "کیا ہو گیا پیر میں شامو؟"

"کچھ نہیں بھیّا کانٹا لگ گیا ہے۔ وہ کوئی صاحب ادھر گیٹ پر کھڑے ڈاکٹر صاحب کو پوچھ رہے ہیں۔"

"تو تم نے کہدیا ہوتا کہ وہ نہیں ہیں یہاں۔"

"وہ تو میں نے کہدیا تھا۔"

"بس تو ٹھیک ہے۔"

"لیکن اب وہ آپ کو بُلا رہے ہیں۔"

"اچھا چلو آتے ہیں۔" پھر موہنی کو بٹھاتے ہوئے جو کھڑی ہو گئی تھی وہ جھپٹا ہوا چلا گیا اُس کے کوئی پندرہ منٹ بعد ہی کچھ فاصلہ پر اُس کو ڈاکٹر کے بولنے آواز آئی اور وہ بُری طرح سٹپٹا گئی۔ وہ مالی سے باتیں کرتا ہوا پہلے کچھ قریب آتا ہوا معلوم ہوا پھر اُس کی آواز کچھ دور سے آنے لگی۔ موہنی کو کچھ اطمنان ہوا اور وہ اپنا رُکا رُکا سانس چھوڑ کر آزادی سے بیٹھ گئی لیکن پھر وہی آواز بہت قریب سے آنے لگی جس میں اب قدموں کی آہٹ بھی شامل ہو گئی تھی۔ اور وہ پریشان ہو کر پہلے تو کھڑی ہوئی پھر بیٹھ گئی بہت لجائی اور سمٹی سمٹائی ہوئی۔ لیکن جس بنچ پر وہ بیٹھی تھی وہ چنبیلی کی جھاڑی کی آڑ میں تھی اس لئے ابھی تک وہ اُس کی نظر میں نہیں آئی تھی لیکن پھر یکا یک ہی وہ مردانہ حُسن اور وجاہت کا پیکر اُس کے سامنے ہی آ کر حیران و ششدر کھڑا رہ گیا۔

"آہا آپ یہاں ہیں؟" چہرے پر آئی ہوئی خوشی کی لہر کو وہ چھپا نہ سکا۔

"میں بھی تو کہوں کہ آج ماں جی ورانڈے میں اکیلی کیوں بیٹھی ہیں۔" کچھ دیر کھڑے رہنے کے بعد اُس کے سامنے والی بنچ پر بیٹھتے ہوئے اور اُس پر ایک

گہری نظر ڈالتے ہوئے اُس نے کہا۔ اور پھر سفید ساڑی میں اُس کے سادہ سادہ معصوم اور پاکیزگی سے بھرپور حُسن سے مرعوب ہو کر اپنی نظریں جُھکالیں اور ایک عجیب سی ٹھنڈی ٹھنڈی میٹھی میٹھی سی تپش کا اُس کو اپنے اندر احساس ہوا۔ ایک ایسی تپش جس کا کوئی نام نہیں ہوتا اور اپنے اضطراب کو چھُپاتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھ کر اُس نے کہا۔

"اوینا شس کہاں ہے آج؟"

"کون ماما" بچی چہکی۔ "اُن کو تو کسی نے بُلایا تھا۔ کوئی صاحب آپ کو بُلانے آئے تھے جب آپ نہیں ملے تو ماما کو بُلوایا اور اپنے ساتھ کہیں لے گئے شائد۔ یہاں تو وہ ہیں نہیں۔"

"کون ہو سکتا ہے؟" سوچتے ہوئے ڈاکٹر نے کہا۔ "یہاں تو اُس کی جان پہچان کا کوئی ہے نہیں میرے خیال میں تو۔"

"کوئی مریض ہو گا۔" بچی نے نہائت بھولے پن سے باپ کی گود میں دونوں کہنیاں ٹکاتے ہوئے کہا۔

"تو تمہارے ماما کوئی ڈاکٹر ہیں جو مریض دیکھنے گئے ہوں گے۔" ڈاکٹر اُس کو بنچ سے اُٹھا کر گود میں بٹھاتے ہوئے بولا۔

اور جب وہ اُس کو گود میں بٹھا کر پیار کر رہا تھا تو بے ارادہ ہی نہ جانے کیسے دونوں کی نگاہیں آپس میں ٹکرا گئیں اور پھر بچی کو چھوڑتے ہوئے جب دوبارہ ڈاکٹر نے نظر اُٹھا کر اُسے دیکھا تو اُس کا چہرہ سُرخی لئے ہوئے تھا جیسے پورے جسم کا خون اُس پیلے چہرہ میں سمٹ آیا ہو اور ماتھے پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں پھوٹ آئی تھیں اور وہ بے چین سی بار بار پہلو بدل رہی تھی۔ ڈاکٹر نے اُس کی اِس حالت کو بدلنے اور اُس کی جھجک کو کسی حد تک دور کرنے کیلئے باتوں کا سلسلہ شروع کیا۔

"ہاں صاحب تو آپ کو پسند آیا باغ ہمارا؟"

"جی؟" اُس نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔
"میں پوچھ رہا ہوں آپ کو باغ اچھا لگا؟" ڈاکٹر نے مُسکرا کر اپنا جملہ دہرایا۔
"جی بہت۔"
"لیکن آپ نے ابھی پورا دیکھا کہاں ہو گا۔"
"دِکھا دیا۔ سب دِکھا دیا ماما نے اور میں نے۔" اُس کے جواب دینے سے پہلے ہی پنکی چمک کر بول اُٹھی۔
"اچھا آپ نے بھی۔" ڈاکٹر نے مُسکرا کر کہا۔
"جی میں نے زیادہ دِکھایا۔"
اور پھر بات چیت کا سلسلہ جاری رکھنے کے لئے وہ گُلاب کے ایک پودے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔
"وہ دیکھئے اُدھر گُلاب کے ایک ہی پیڑ پر تین رنگ کے گُلاب آتے ہیں۔ سفید ہلکا گلابی اور گہرا سُرخ اور ذرا پھولوں کا سائز دیکھئے اور پیڑ کا بھی۔ پیڑ میں نے اِسی لئے کہا۔ اتنا لمبا اور پھیلا ہوا۔ درخت ہی لگتا ہے اچھا خاصا۔"
اور پھر وہاں سے اُٹھ کر اُس نے ایک سفید پھول توڑا ہی تھا کہ پنکی بھاگی ہوئی آئی اُس کے پاس اور بڑے انداز میں اپنے بال دونوں ہاتھوں سے چھوتے ہوئے بولی۔
"میرے بالوں میں لگا دیجئے۔ دیکھئے بالکل خالی ہیں۔
"ضرور لگائیں گے بھئی۔ ڈاکٹر نے اُس کی اِس حرکت پر مُسکراتے ہوئے کہا۔
"ایک آنٹی کے لئے بھی دیدیجئے نا! اُن کے بالوں میں تو اور بھی اچھا لگے گا۔
"اچھا بھئی اچھا۔" اُس نے دوسرا پھول توڑ کر دیتے ہوئے کہا۔
"لو دے کر آؤ آنٹی کو۔" اور وہ واپس آکر وہیں بیٹھ گیا۔

"لیجئے آنٹی اپنا پھول"
"نہیں تم ہی لگا لو یہ بھی۔ لاؤ ہم لگا دیں تمہارے بالوں میں"
"اچھا تو میں پن لے آؤں۔ یہ کہتے ہوئے وہ بھاگ کر وہاں سے چلی گئی۔
"آپ بھی عجیب ہیں واقعی یعنی پھول لینے میں بھی تکلف ہے"
"آپ نے بیکار ہی توڑا دوسرا پھول" موہنی نے بڑی ہمت کر کے زبان کھولی۔
"کیوں؟"
"وہاں لگا ہوا زیادہ اچھا لگ رہا تھا"
"لیکن اِس کی زیادہ مناسب جگہ اِس وقت آپ کے ..."
یکایک ہی سنبھل کر وہ خاموش ہو گیا وہ پھر غلطی کرنے جا رہا تھا۔ موہنی کے چہرہ کا رنگ دیکھ کر اُس کو احساس ہوا۔ اور پھر ماحول پر خاموشی چھا گئی۔ دونوں ہی خاموشی سے سر جھکائے بیٹھے تھے کہ اوینانش کی آواز پر دونوں نے ایک ساتھ ہی نظر اُٹھائی۔
"کمال ہے صاحب عجیب چیز ہیں آپ بھی۔ یعنی بغیر کسی کو کچھ بتائے ہوئے ہاسپٹل سے غائب ہو گئے اور یہاں تھکا مارا ہم غریبوں کو۔ آخر تھے کہاں آپ؟" اُس نے غصّہ سے ڈاکٹر کو دیکھتے ہوئے کہا۔
"ہو کیا گیا آخر اتنے جوش میں کیوں آ رہے ہو۔ کس خطا میں تلاش ہو رہی تھی میری"
"خطا کیا ہوتی وہ آپ کے دوست ڈاکٹر رضوی صاحب تھے۔ ایسے بے وقت ٹپکے آ کر کہ چائے بھی گول کرا دی"
"چائے تو ابھی ہم نے بھی نہیں پی لیکن یہ تو بتاؤ کہ وہ چلے کہاں گئے۔ تم نے روکا نہیں اُن کو"
"جی ہاں آپ تو بھاگے بھاگے پھریں اور میں آپ کے دوستوں کو سمیٹتا

بھردں۔ دوست وہ آپ کے تھے یا میرے جو میں روکتا۔"

"ارے بھئی میں ذرا گاڑی ٹھیک کرانے چلا گیا تھا اور اُسکو ورکشاپ پر چھوڑ کر رکشا سے واپس آیا ہوں ابھی۔ کچھ تو بتاؤ اتنے دِن میں وہ آیا تھا نامعقول تو کچھ دیر ٹھہرا کیوں نہیں۔"

"ٹھہرتے کیا وہ تو ہوا کے گھوڑے یعنی ٹیکسی پر سوار آئے تھے کہنے لگے گھر پر نہیں تو ہاسپٹل جا کر دیکھ لیا جائے۔ کبھی کسی کام میں لگے ہوئے ہوں۔ وہاں پہنچے تو آپ کی صورت تو کہیں نظر نہیں آئی۔ ایک اور ڈاکٹر ان کی پہچان کے مل گئے تھے اُن سے ہی آپ کی کمی کو پورا کیا تھوڑی دیر اور پھر وہ مجھے یہاں سامنے سڑک پر چھوڑ کر چلے گئے واپس۔ بولے اِس وقت اُن کا انتظار نہیں کیا جا سکتا آج ہی دہلی پہنچنا ضروری ہے۔" ایک ہی سانس میں وہ پوری بات کہہ گیا۔

"تو پھر اتنی سی دیر کے لئے آنا کیا ضروری تھا؟"

"ویسے وہ پھر آئیں گے اور ٹھہریں گے آپ کے پاس دِل بھر کے۔ اطمنان رکھئے اگلے ہفتہ کئی دن رہیں گے آکر۔"

"اچھا۔" ڈاکٹر مُسکرا دیا پھر بولا۔

"بڑا ہی اچھا انسان ہے اور اتنا ہی پیارا دوست بھی۔"

"ہاں اس میں شک نہیں۔" اویناش نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ "بڑے بھلے آدمی معلوم ہوتے تھے۔ دیدی کے شہر ہی کے تو ہیں۔"

"ہاں وہ سہارنپور میں ہی پریکٹس کر رہا ہے آج کل۔"

اور موہنی ایکدم چونکی۔ ایک نئے اندیشے نے سر اُبھارا۔ کہیں وہی تو نہیں جو میرا علاج کرتے ہیں۔ اُن کی بھی بابوجی بڑی تعریف کرتے ہیں۔ اگر وہ آئے اور اُنہوں نے مجھے یہاں دیکھا تو۔ تو۔ کیا سوچیں گے وہ۔ اُس نے دِل میں کہا پھر اُسے یاد آیا۔ اُن کا نام تو سعید ہے۔ ڈاکٹر سعید۔ تو پھر یہ کوئی اور ہونگے

اور وہ خاموشی سے اُٹھ کر بچی کو ساتھ لئے ہوئے ماں کے پاس چلی آئی۔ وہ دونوں کچھ دیر تو وہیں بیٹھے رہے پھر واپس آ کر لان میں بچھی کرسیوں پر بیٹھ کر چائے کا انتظار کرنے لگے۔

اِس بات کے کوئی دوسرے یا چوتھے روز انجانے میں ایک ایسا واقعہ ہو گیا جس کے لئے وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ ہوا یہ کہ وہ سب روز کی طرح اس وقت بھی باغ میں گھوم پھر رہے تھے۔ موہنی کبھی تو تھک کر کہیں بیٹھ جاتی اور کبھی بچی کے کہنے سے اُٹھ کر کسی پیڑ یا پودے کے پاس جا کر کھڑی ہو جاتی اسی طرح ڈاکٹر کبھی اُن میں سے کسی سے کوئی بات کر لیتا اور پھر مالی کو ہدایتیں دینے میں مصروف ہو جاتا۔ کبھی کھرپی اُس کے ہاتھ سے لے کر خود ہی پودوں کی جڑوں میں کچھ کھدائی صفائی وغیرہ شروع کر دیتا۔ موہنی کی جھجک بھی رفتہ رفتہ کم ہو رہی تھی اب وہ ڈاکٹر کی موجودگی سے پسینے پسینے نہیں ہوتی تھی۔ اُس کی سادہ اور مہربان شخصیت نے اُس کے دِل میں کچھ نرم گوشے پیدا کر دیئے تھے۔ اب وہ اُس کو اپنا محسن نظر آتا تھا۔ اور کبھی کبھی تو نہ چاہتے ہوئے بھی اُس کی خواہش ہوتی کہ وہ زیادہ سے زیادہ دیر اُسکے سامنے رہے وہ گھر میں نہ ہوتا تو اُس کے لئے اُس کا انتظار مشکل ہو جاتا۔ اور اُس کی بے چین نظریں ہر آہٹ پر خود بخود کوٹھی کے پھاٹک کی طرف اٹھ جاتیں۔ کسی بھی گاڑی کے ہارن کی آواز پر اُس کا دل بُری طرح دھڑک اٹھتا اور وہ لرز کر رہ جاتی جب ہی اُس کے لاشعور میں پر کاش کہیں آس پاس ہی کھڑا ہوا نظر آ جاتا اور وہ بے حد اُداس اور پریشان ہو جاتی۔ اُس کو اپنے اوپر بہت غصہ آتا کہ اُس کو یہ ہو کیا رہا ہے لیکن کچھ دیر کے بعد ہی جب ڈاکٹر سامنے آتا تو وہ اپنے کو بالکل بے بس پاتی اور پھر اتنی اُلجھ جاتی کہ کسی بات کا بھی ہوش نہ رہتا۔

ایسے میں اپنی کشتی اُس کو بھنور میں ہچکولے کھاتی ہوئی معلوم ہوتی جس کو دور دور کوئی سہارا دینے والا نظر نہ آتا۔ اس وقت وہ اسی اُدھیڑ بُن میں تھی کہ پنکی کی آواز پر چونک پڑی۔ وہ اُس کا ہاتھ چھوڑ کر باپ کی طرف بڑھتے ہوئے یکایک ہی زور سے بول اُٹھی تھی۔

"پپّا! بس چھوڑیئے کام اب شام ہوگئی ہے بالکل۔ دیکھئے کتنا اندھیرا ہونے لگا بس دو پھول توڑ دیجئے۔ آنٹی کا ہاتھ نہیں جائے گا۔ اونچے لگے ہیں وہ والے" اُس نے دو بڑے بڑے سُرخ رنگ کے گلابوں کی طرف اشارہ کیا اور ڈاکٹر نے بیٹھے بیٹھے ہی مُڑ کر اُن دونوں کو دیکھا جو ذرا آگے آ کر کھڑی ہو گئی تھیں۔ اویناش نہ معلوم کہاں چلا گیا تھا اور مالی ذرا فاصلہ پر کھڑا ہوا کسی تراش خراش میں مصروف تھا۔ ڈاکٹر نے ایک منٹ بعد اپنا کام پورا کر کے کھُرپی وہیں چھوڑ دی اور کھڑا ہو گیا۔

"ارے آپ لوگ کب آ کر کھڑی ہو گئیں مجھے پتہ ہی نہیں چلا"

اُس نے موہنی سے مخاطب ہو کر کہا اور ایک بھرپور نظر اُس کے اُوپر ڈالی سُوکھے سُوکھے بالوں کا سادا سا جوڑا بنا ہوا۔ چہرے پر جاتی ہوئی شفق کا ہلکا ہلکا سا عکس جس میں چہرے کی پیلاہٹ میں ہلکا سا نارنجی پن شامل ہو گیا تھا اور ساڑی۔ اُس نے ابھی تک ساڑی پر تو غور کیا ہی نہیں تھا۔ ہلکی گلابی زمین پر گہرے گلابی گلابی پھول بکھرے ہوئے۔

"اوہ!" اُس نے دبی۔ دبی لمبی سی سانس لی اور نہ جانے کیسے اُس کے مُنہ سے ایک بے تکا سا جُملہ نہ چاہتے ہوئے بھی نکل ہی گیا۔

"آج تو آپ کو یہ گہرا گلابی پھول اپنے جوڑے میں لگانا ہی پڑے گا ورنہ بڑا ظُلم ہوگا ان بیچارے پھولوں پر"

اور ہاتھ میں پھول لئے ہوئے جیسے ہی اُس نے قدم بڑھایا، پنکی زور سے چیخی۔

"پپّا تھوڑے سے رابیل کے پھول بھی۔"

"اچھّا صاحب!" مسکراتے ہوئے وہ بائیں طرف کو مڑا اور رابیل کے جھاڑ کے پاس پہونچ کر ایک پھول پر ہاتھ رکھّا ہی تھا کہ اُس کی جڑ کے پاس سے تیز قسم کی سرسراہٹ کے ساتھ کوئی ٹھنڈی ٹھنڈی اور چکنی سی چیز اُس کے پیر کے نیچے سے ٹکرائی۔ جیسے موٹا سا رسّا ہو۔ اُس نے ایک چیخ کے ساتھ بڑی پھُرتی سے پیر کو جھٹکا دیا اور تیزی سے اُچھل کر ذرا آگے آکر کھڑا ہو گیا۔ رگھّو مالی اُس کی چیخ پر چونکا ہو کر بھاگا اور قریب آکر بولا۔

"کیا ہوا صاحب؟"

"سانپ تھا بھئی بہت بڑا سا۔ رابیل کی جڑ کے پاس جیسے ہی میں نے پیر رکھّا، وہ میرے پیر کے اوپر آپڑا۔"

"کاٹا تو نہیں صاحب!"

"نہیں۔ میں نے فوراً ہی جھٹک دیا تھا اُس کو۔"

"لیکن۔ لیکن۔ یہ خون؟" وہ جھُک کر اُس کے انگوٹھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ اور اُس کے کہنے پر ڈاکٹر ذرا سا جھکا اور پیر کو چپّل میں سے نکال کر اپنا انگوٹھا دیکھا اور چُپ چاپ کھڑا ہو گیا۔

اُدھر موہنی نے جو سر جھکائے کھڑی تھی، ڈاکٹر کی چیخ پر نظر اُٹھائی اور اُس کو زور سے اُچھل کر اپنی طرف آتے ہوئے اور پھر ایک بڑے سے سانپ کو تیزی سے رینگتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا اتنا بڑا سانپ اُسنے زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھا، کچھ دیر ہمّت کئے ہوئے وہ اپنے پیروں پر ٹکی کھڑی رہی لیکن جب خون کا نام آیا تو نہ جانے کیسے اُس کے پیروں میں حرکت ہوئی اور اُلٹے سیدے قدم رکھتی ہوئی قریب آکر اُس کے پیر پر جھُکتے ہوئے بڑی مشکل سے بولی۔

"کاٹ لیا گیا؟" اور ایک لرزتی ہوئی چیخ کے ساتھ پیچھے کی طرف زمین پر گری اور بے ہوش ہو گئی۔

ڈاکٹر نہیں نہیں کرتا رہا لیکن اُس نے کچھ نہیں سُنا اور جب ڈاکٹر نے موہنی کی طرف بڑھنا چاہا، رگھو نے اُس کا پیر پکڑ لیا اور بندھ باندھنے کے لئے کپڑے کی تلاش میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

"چھوڑو بھئی۔" اُس نے اپنا پیر چھڑاتے ہوئے کہا۔ سانپ نے کاٹا نہیں ہے یہ تو کوئی سخت سی چیز۔ کوئی گھانس پھونس یا کوئی سوکھا ڈنٹھل کسی چیز کا سانپ کو زور سے جھٹکتے میں لگ گیا ہے پیر میں۔

"یہ آپ کیسے کہہ رہے ہیں؟"

"ہم جانتے ہیں بھئی۔ تم جاؤ اپنا کام کرو۔"

"اچھا صاحب!" اور وہ اطمنان سے آگے بڑھ گیا۔

ڈاکٹر نے موہنی کو اُٹھایا اور بنچ پر لٹا کر، تیزی سے کوئی دوا لانے کے لئے اندر کی طرف جھپٹا چلا جا رہا تھا کہ راستے میں ماں اور اویناش بدحواسی کے عالم میں بھاگ کر آتے ہوئے نظر آئے۔

"کیا ہوا بیٹا سریندر؟" ماں نے گھبراہٹ میں اُس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"وہ سانپ کہاں تھا....."

"کچھ بھی نہیں ہوا ماں جی۔ اُس نے کاٹا نہیں۔ میں نے پورے زور میں جھٹک دیا تھا اُس کو فوراً ہی۔"

دوسری طرف اویناش نے اُس کے دونوں پیر پائنچے ہٹا ہٹا کر دیکھنے شروع کئے اور دائیں پیر کے انگوٹھے پر نظر ڈال کر ڈاکٹر کی طرف دیکھا جہاں کچھ خون اور چمک آیا تھا۔

"ارے یہ تو کسی سخت چیز کے لگ جانے کی وجہ سے ہلکا سا خراش آگیا ہے دیکھ نہیں رہے ہو۔ سانپ کے دانت کا نشان بھی تو ہوتا۔"

"اور ہاں اویناش!" ڈاکٹر نے بات بیچ میں ہی چھوڑ کر کہا۔

"وہ تمہاری دیدی سانپ کو دیکھ کر ڈر گئیں۔ بے ہوش پڑی ہیں۔

میں دوا لینے جا رہا ہوں۔ تم دیکھو اُن کو، میں ابھی آیا۔"

"ارے ہاں کہاں ہے موہنی۔" ماں نے گھبرا کر جلدی جلدی قدم بڑھائے اور اُس کے پاس جا کر اُسکا سر سہلاتے ہوئے بولیں۔

"ہائے بچی ڈر گئی۔ کمزور تو ہے ہی۔ اُس نے کہاں اتنے بڑے سانپ دیکھے ہوں گے۔ وہ تو یہ کہو کہ پنکی کی نظر اُس پر نہیں پڑی ورنہ کیا ہوتا۔ وہ تو بس سانپ کا نام سنتے ہی بھاگ گئی۔"

ہوش آنے پر یہ معلوم کر کے کہ سانپ نے کاٹا نہیں تھا بلکہ وہ کسی تنکے وِنکے کی رگڑ کا نشان تھا موہنی کی جان میں جان آئی اور رات تک وہ ٹھیک بھی ہو گئی لیکن ایک عجیب سی خلش اور بے چینی اور سب سے زیادہ سخت قسم کی شرمندگی نے اُس کو بُری طرح نڈھال کر دیا تھا۔ کھانا کھانے سے بھی اُس نے انکار کر دیا اور جب سونے کے لئے لیٹی تو کروٹیں بدلتے بدلتے اُس کا جسم دُکھنے لگا لیکن نیند کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ ڈاکٹر کا سامنا کرنے کی تو اُس میں بالکل بھی ہمت نہیں رہ گئی تھی اسی لئے وہ کمرہ میں بند ہو کر رہ گئی تھی۔ اُدھر ڈاکٹر بھی جیسے کہیں کھو کر رہ گیا تھا۔ کھانے کے درمیان وہ ایک لفظ بھی نہیں بولا اور جلد ہی بستر پر پہونچ کر خیالوں کے تانے بانے میں کچھ اس طرح الجھا کہ تین بج گئے اور پلک اُس کی ایک منٹ کے لئے بھی نہیں جھپکی۔ جب بھی کروٹ لیکر سونے کی کوشش کرتا، بے ہوش پڑی ہوئی موہنی کا حسین چہرہ سامنے آ کر لہرا جاتا اور ایک عجیب سی سرشاری اُس کے احساسات میں جاگ اُٹھتی۔ وہ بے نام سی کسک اور میٹھی میٹھی ہلکی سی تپش اب آگ بن کر اندر ہی اندر پھیل رہی تھی بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب رہے گا کہ وہ ننھی سی چنگاری جو ایندھن کے ڈھیر میں کہیں اندر دبی ہوئی تھی ہوا لگتے ہی شعلوں میں بدل رہی تھی اور اب

وہ باقاعدہ اُس کی لپیٹ میں آگیا تھا۔ بڑی مشکل سے صبح ہوتے اُس کی آنکھ لگی اور جب وہ جاگا تو دھوپ چڑھ آئی تھی گھڑی پر نظر ڈالی تو آٹھ بج رہے تھے۔ بڑی دیر ہو گئی تھی۔ جلدی جلدی تیار ہو کر وہ ہاسپٹل کے لئے روانہ ہو گیا۔ بدن میں انتہائی سستی اور تھکا تھکا سا ذہن لئے ہوئے وہ وہاں کام کرتا رہا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کل شام کا تصوّر دبے پاؤں آدھمکتا اور وہ دھیمے سے مُسکرا دیتا۔ دو تین دن اِسی کیفیت میں گذر گئے موہنی اب اُس کے سامنے بالکل نہیں پڑتی تھی اتنے دن میں اُس کی ہلکی سی جھلک بھی اُس کو نظر نہیں آئی تھی۔ لیکن وہ پُرسکون تھا۔ اُس کے لئے تو بس وہی کافی تھا جو اُس دن ہوا اور اِس واقعہ کے ٹھیک چار دن بعد ایک انہونی سی بات پھر ہو گئی جو کسی کے خیال میں بھی نہیں آسکتی تھی۔ بات ایسی تھی کہ موہنی آج دوپہر ہی سے کچھ زیادہ بے چین تھی۔ کسی بات یا کسی کام میں اُس کا دِل نہیں لگ رہا تھا باپ اور لکشمی بھی یاد آرہے تھے اور ستیش کا خیال تو جب سے ایک منٹ کو بھی نہیں اُتر رہا تھا اُس کے ذہن سے۔ ایک تو اُس دن کے واقعہ کے بعد سے وہ خود ہی اُلجھی اُلجھی سی تھی۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے یہاں اب وہ کسی طرح بھی ٹھہرنے کے لئے تیار نہیں تھی۔ حالات اور واقعات اب تیزی سے موڑ لے رہے تھے جن سے وہ بے حد پریشان اور سراسیمہ تھی اوپر سے یہ ہوا کہ دوپہر کوئی ساڑھے گیارہ بجے کے قریب بارش کی ہلکی ہلکی پھوار کا مزا لینے یا یوں کہئے کہ اپنے دماغ کی بے چینی کو کم کرنے کے لئے اپنے کمرہ سے نکل کر ٹہلتی ہوئی وہ گیٹ تک پہونچ گئی تھی۔ وہاں دور سے آتا ہوا ایک نوجوان اُس کو بالکل ستیش جیسا لگا اور وہ اُداس ہو گئی تھی اِسی لئے آج پورا دن وہ اپنے کمرہ سے نہیں نکلی۔ کھانا دانا بھی اُس سے نہیں کھایا گیا۔ بہ مشکل شام کی چائے بھی اوینا ش کے بہت بار کہنے پر اُس نے پی تھی۔ رات کے کھانے پر بھی وہ نہیں گئی اور اب ساڑھے نو

بج رہے تھے۔ اوینا ش اپنے کمرہ میں جا کر لیٹ گیا تھا اور ماں بھی نہ جانے کہاں تھی۔ ریڈیو اوینا ش نے پوری آواز سے کھول رکھا تھا اور اُس کی آواز ہر طرف گونج رہی تھی۔ وہ بھی اپنے کمرہ میں اپنے بستر پر لیٹی چُپ چاپ گانے سُن رہی تھی مگر جیسے ہی مکیش کا گایا ہوا گانا شروع ہوا۔

دنیا سے جانے والے جانے چلے جاتے ہیں کہاں
کتنا ہی ڈھونڈھو اُن کو نہیں قدموں کے بھی نشاں

تو وہ بُری طرح تڑپ اُٹھی۔ کتنی ہی دیر تک آنسو اُس کے نہیں رُکے اور پھر اُس کو اپنا دِل ڈوبتا ہوا اور دم گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وہ اُٹھ کر باہر آئی اور دبے پاؤں کوٹھی کے گیٹ تک پہونچ گئی جو ڈاکٹر کے انتظار میں ابھی تک کھُلا ہوا تھا۔ ڈاکٹر شام ہی سے کسی پارٹی میں گیا ہوا تھا اور موہنی اُس کو اِس وقت گھر میں نہ دیکھ کر سمجھی تھی کہ ابھی ابھی وہ کہیں باہر نکلا ہوگا موہنی کھوئی کھوئی سی گیٹ سے باہر نکل آئی۔ یہاں آکر اُس کو کچھ سکون کا احساس ہوا اور اُس کے قدم خود بخود ہی بڑھ کر ایک طرف کو اُٹھنے لگے۔ اُس کے باہر نکلتے ہی لمبا چوڑا قدآور السیشن جمبو بھی کوں کوں کرتا ہوا اُس کے پیچھے ایک چھلانگ میں گیٹ کو پار کر کے دُم ہلاتا ہوا اُس کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔

ارے تو بھی آگیا۔ موہنی آہستہ سے ممنائی، اچھا چل اب میں ادھر اکیلی تو نہ رہوں گی۔

اور ابھی مشکل سے وہ دس بیس قدم ہی چلی ہو گی کہ سامنے سے آتی ہوئی موٹر کی ہیڈ لائٹس میں اُس کا پورا بدن جیسے نہا گیا۔ گھبراہٹ سے بچنے کیلئے جیسے ہی وہ ایک طرف کو تیزی سے مُڑی، پیر پھسل گیا اور ابھی اُس نے اپنے آپ کو سنبھالا ہی تھا کہ گاڑی اُس کے قریب آکر رُک گئی۔

"ارے آپ؟" ڈاکٹر کی حیرت اور مسرت سے لبریز چیخ پر وہ بُری طرح چونکی۔

"کہاں کا ارادہ ہے؟" مسکراتے ہوئے وہ گاڑی سے نیچے اُتر آیا۔
"جی کہیں کا بھی نہیں۔" وہ ہکا بکا کھڑی رہ گئی تھی۔
"کہیں کا تو ہوگا۔"
"نہیں۔ وہ تو..... بس ویسے ہی....."
"آئیے میں آپ کو سیر کرا لاؤں تھوڑی سی۔"
"نہیں نہیں۔ اِس وقت نہیں۔" وہ اب پریشان ہونے لگی تھی۔
"آپ تو خواہ مخواہ گھبراتی ہیں ہر بات سے۔"
"جی۔ جی۔ وہ ....." وہ پھر ہکلانے لگی۔
"جی۔ دی۔ کچھ نہیں، آئیے!" اُس نے دھیمے سے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا اور گاڑی کی طرف چل دیا۔ اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی نہ جانے کونسی مقناطیسی کشش کے آگے بے بس ہو کر اُس کے ساتھ آگے والی سیٹ پر جا کر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر تک وہ اُس کی بوکھلائی ہوئی حرکتوں اور ماتھے پر چھل چھل پھوٹتے ہوئے پسینے سے لطف اندوز ہوتا رہا جسے وہ بار بار ہاتھ سے صاف کر رہی تھی پھر خاموشی سے پینٹ کی جیب سے اپنا رومال نکال کر اُس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے بولا۔
"لیجئے۔ یہ کافی ہوگا نا؟ یا اور بڑا چاہئے؟"
اور ایک عجیب سی اضطراری کیفیت میں موہنی نے پلٹ کر اُس کے چہرے کی طرف دیکھا جہاں مسکراہٹ کے ساتھ ہلکی سی شرارت بھی رقصاں تھی اور پھر اُس کے اوپر انتہائی شرمندگی۔ پشیمانی اور گھبراہٹ کا ایک دورہ سا پڑ گیا۔ سر نیچے جھکتا چلا گیا ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو گئے۔ پورے بدن میں کپکپی دوڑ گئی اور تھوڑا بہت خون جو جسم میں بچا ہوا تھا، چہرے کی طرف پھیلتا ہوا آیا اور اُس کو گلابی بنا گیا اور اسی کیفیت کے عالم میں اُس کا ہاتھ گلے میں پڑے ہوئے ساڑی کے پلّو پر پہونچ گیا جس کو بار بار وہ آگے کی طرف

کھینچ کر درست کرنے لگتی۔ ڈاکٹر اس کی طرف دیکھتا اور ہولے سے مسکرا دیتا
اچانک ہی گاڑی کے بریک لگنے کی آواز سے موہنی نے سر اُٹھا کر باہر دیکھا
یہ کسی ندی کا غیر آباد اور سنسان کنارا تھا۔ ڈاکٹر اُچھل کر نیچے کودا اور دوسری
طرف کا دروازہ کھول کر کھڑا ہو گیا۔

"آیئے!" اُس نے بڑی محبّت اور اپنائیت سے کہا۔
اور بڑے تذبذب اور تھکے ہوئے انداز سے وہ بھی نیچے اتر آئی۔
"آیئے نا! اب وہیں کھڑی رہ گئیں!" ڈاکٹر نے پیچھے دیکھتے ہوئے کہا۔
اور وہ جھجکتی سمٹتی اور کچھ سوچتی ہوئی دھیرے دھیرے اُس کے ساتھ چلنے لگی۔
"آیئے ان پتھروں پر بیٹھ جائیں" ایک جگہ ٹھہر کر ڈاکٹر نے اُس کی
طرف دیکھا۔

"آپ تھک گئی ہیں شائد" اور اُس کے اتنا کہتے ہی وہ وہیں
ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ گئی اور اُس سے کوئی ایک فٹ کے فاصلہ
پر وہ بھی بیٹھ گیا۔

"کتنی خاموشی ہے اِدھر اِس کنارے پر۔" کچھ دیر کے بعد
ڈاکٹر نے کہا۔

"ویسے آس پاس کوئی خوبصورتی تو نہیں ہے اور نہ یہ کوئی تفریح
کا SPOT ہی ہے لیکن برسات کی یہ قدرتی ہریالی۔ یہ پیڑ پودے پھول تو بہر حال
ہیں ہی یہاں اور بہتے ہوئے پانی کا بھی اپنا ایک الگ حُسن ہے اور سب سے
بڑھ کر سکون۔ تنہائی اور یہ بادل کے ٹکڑوں سے آنکھ مچولی کھیلتا ہوا ابھرا ابھرا
نوجوان تیرہ۱۳ یا چودہ۱۴ تاریخ کا چاند۔ یہ سب کتنا اچھا لگ رہا ہے" اور وہ چُپ
ہو گیا۔ کوئی دس منٹ خاموش رہنے کے بعد پھر بولا۔

"دیکھئے بادلوں کے ٹکڑے اب دور پہونچ گئے ہیں اور آس پاس بھی
کوئی نہیں۔ اب ذرا دیر تک اطمنان سے ہر چیز چاندنی میں نہاتی رہے گی کیسا

جادو بھرا سماں ہے۔" اُس نے پُر اُمید نظروں سے موہنی کی طرف دیکھ کر کہا کہ شائد وہ کچھ ہُوں ہاں ہی کر دے لیکن اُس نے تو جیسے اِسوقت نہ بولنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ کچھ دیر تک پھر مکمّل خاموشی چھائی رہی۔ مجبور ہو کر ڈاکٹر نے ہی پھر اس جمود کو توڑا۔

آج کل برسات کی وجہ سے یہ ندی کتنی چنچل نظر آتی ہے۔ کسی مست اور منہ زور دیہاتی لڑکی کی طرح بڑی مٹکتی اور بل کھاتی ہوئی نکلتی ہے اور کہیں کہیں جہاں پاٹ ذرا چوڑا ہے اور بہاؤ کم ہے خصوصاً گرمی کے موسم میں یہاں ذرا ٹھہر ٹھہر کر۔ شرماتی لجاتی اور اپنے آپ میں سمٹتی ہوئی بڑے وقار کے ساتھ چلتی ہے۔ بالکل آپ کی طرح.....“

اب ماحول پر پھر سناٹا چھا گیا تھا۔ ڈاکٹر بھی کچھ سوچنے میں لگ گیا تھا کہ یکایک کوئی پرندہ بولتا ہوا اُن کے سر پر سے گذرا اور اُس نے چونک کر موہنی کی طرف گردن گھمائی۔

”کیا آج آپ بالکل نہیں بولیں گی؟“

”کیا بولوں؟“ اُس نے سر جُھکائے ہوئے کہا۔

”کچھ تو بولئے!“ لہجہ انتہائی نرم اور خلوص سے بھرا ہوا تھا۔

”میرا خیال ہے آپ یہاں آکر کچھ خوش نہیں ہوئیں۔ میں نے کہا نا کہ کوئی خاص خوبصورتی یہاں نہیں ہے۔ چلئے تو پھر کسی اور طرف چلتے ہیں جہاں.....“

”نہیں نہیں۔ بس گھر ہی چلیں گے۔“ اُس نے جلدی سے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا اور اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

”چلتے ہیں ابھی۔ دو منٹ تو ٹھہرئے۔ میں۔ میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔“

”کیا؟“ وہ پھر بیٹھ گئی۔

"یہ آپ کیا سوچتی رہتی ہیں ہر وقت"
"میں؟ کچھ بھی تو نہیں"
"کچھ تو؟"
"اِس وقت تو میں یہ سوچ رہی تھی کہ .... کہ میری خاطر کتنی تکلیف اُٹھا رہے ہیں آپ ایک بیکار سی زندگی کے لئے آپ اتنے زیادہ پریشان نہ ہوں یہ مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا۔ رُک رُک کر اُس نے اپنی بات پوری کر ہی دی۔
"ارے!" ڈاکٹر نے حیرت سے اُس کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔
"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ آپ کی زندگی بیکار ہے؟"
"ارے صاحب یہ تو آپ کسی اور کے دِل سے پوچھیئے کہ آپ کیا ہیں" اُس نے جذبات سے مغلوب ہو کر اور پوری ہمت کو یکجا کرتے ہوئے کہہ ہی دیا۔
"اُف! موہنی نے سر کو ہاتھ سے دباتے ہوئے بڑے کرب سے کہا۔
"آپ کی ان باتوں سے میں بے حد پریشان ہو جاتی ہوں۔ آپ نہیں جانتے آپ کو کیا معلوم کہ ..... کہ۔ اوہ! میں کیسے آپ کو سمجھاؤں۔ آپ ایک ایسے بیکار درخت کو سینچ رہے ہیں جو بالکل ہی سُوکھ گیا ہے۔ اُس میں کونپلیں کِس طرح پھوٹیں گی؟ بتائیے؟"
اُس نے سر اُٹھا کر ڈاکٹر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ نہ جانے اتنے الفاظ کہاں سے آ گئے تھے اُس کے پاس۔
ڈاکٹر کچھ دیر تو حیران و ششدر اُس کے چہرہ کی طرف دیکھتا رہ گیا پھر بڑے ٹھہرے ہوئے انداز میں بولا۔
"نہیں۔ درخت نہیں سوکھا ہے۔ صرف چھوٹی ڈالیاں اور پتیاں ضرور سُوکھ کر جھڑ گئی ہیں۔ درخت ہرا ہوگا۔ اُس کو ہرا ہونا ہی ہے۔ اپنے لئے نہ سہی دوسروں کے لئے تو اُسے کچھ سوچنا ہی ہوگا خصوصًا ایک معصوم

کے لئے۔ ایک ننھے سے پودے کے لئے جس کی زندگی اب صرف اُس ایک درخت کے سہارے قائم ہے ورنہ۔ ورنہ یہ بڑا ستم ہوگا بڑی بے انصافی ہوگی اور ....‘‘

’’نہیں نہیں۔‘‘ موہنی نے اور زیادہ تڑپتے ہوئے کہا۔ ’’یہ بہت مشکل ہے۔ بالکل ناممکن۔ جس پیڑ کی جڑیں کھوکھلی ہو چکی ہوں یا بجلی نے جس کو جلا دیا ہو اور بچا کھچا حصہ سلگ سلگ کر راکھ کی صورت میں خود ہی گر رہا ہو وہ کسی کو کیا سہارا دے سکتا ہے۔ اُس سے کسی طرح کے سائے کی امید رکھنا کوئی عقلمندی نہیں ہے رہی معصوم کے سہارے کی بات تو اُس کے لئے کسی مضبوط سہارے کی ضرورت ہے نہ کہ راکھ اور مٹی کے ڈھیر کی۔ اور ایسے ہزاروں سہارے دنیا میں مل جائیں گے۔ ایک سے ایک جاندار اور خوبصورت سہارے۔ کمی کیا ہے۔‘‘

اُس نے دِل کڑا کر کے یہ سب کہہ تو دیا مگر آواز کانپ کانپ گئی وہ بہت جذباتی ہو گئی تھی اور تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر نے دیکھا کہ وہ رونے لگی ہے وہ گُنگ ہو کر رہ گیا تھا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسے اُس کو چپ کرائے۔ بڑی اُداس نظروں سے وہ بار بار سر اُٹھا کر اُس کو سکتے ہوئے دیکھتا اور بے بسی سے سر جھکا کر پھر کچھ سوچنے لگ جاتا یکایک ہی ٹھنڈا سانس لیتے ہوئے وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

’’آیئے چلیں۔‘‘ دھیمی آواز سے اُس نے کہا۔ ’’مجھے افسوس ہے کہ میری باتوں سے آپ کو دُکھ پہونچا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ۔ کہ۔ آپ ...‘‘

’’اگر آپ مجھے معاف کر سکیں تو ....‘‘

’’اُفوہ!‘‘ موہنی نے اُس کا جملہ پورا نہیں ہونے دیا۔

’’یہی تو مشکل ہے۔ آپ مجھے نہ جانے کیا سمجھتے رہیں۔ میں آپ کے سامنے کیا ہوں کچھ بھی تو نہیں۔ بھگوان کے لئے مجھے اتنا اوپر نہ لے جایئے۔ اتنا بڑا نہ سمجھئے مجھے۔ کہاں سورج اور کہاں دھرتی کا ایک چھوٹا سا ذرّہ۔ کہاں کِھلا ہوا ایک پھول اور کہاں ایک سُوکھا ہوا پیلا پتا۔ جس کو ہوا اُڑائے اُڑائے پھرتی

ہے۔ چاہے جہاں ڈال دیا لے جاکر۔ میں کتنے دن سے سوچ رہی ہوں کہ آپ سے کہوں لیکن صبح سے شام ہو جاتی ہے اور شام سے پھر صبح اور میں نہیں کہہ پاتی کہ میرے پاس کچھ بھی نہیں بچا ہے۔ میرے لئے آپ اپنی زندگی خراب نہ کریں۔ آپ نے میرے اوپر احسان کیا ہے اور کئے ہی جارہے ہیں برابر۔ میں۔ میں آپ کو برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔ نہیں دیکھ سکتی"۔ اور وہ روتے ہوئے اُن پتھروں پر ایک طرف کو لڑھک گئی۔ اور وہاں کھڑے کھڑے ڈاکٹر کے ہاتھ پیر پھول گئے کہ اُس کی حالت بگڑ نہ جائے کہیں لیکن اُس وقت وہ اُس کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا تھا۔ ناچار اسی طرح پریشان اور پشیمان وہ وہیں کھڑا ہوا اُس کے بہتر ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ کچھ دیر کے بعد اُس نے خود ہی پلٹ کر اسکی طرف دیکھا اور بڑی نقاہت کے ساتھ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی اُس کے کھڑے ہوتے ہی ڈاکٹر نے آہستگی سے قدم اُٹھایا اور دونوں خاموشی سے چلتے ہوئے گاڑی تک پہونچ گئے۔ ڈاکٹر نے چاہا کہ وہ اُس کو گاڑی میں چڑھنے میں مدد دے لیکن وہ یہ بھی نہ کر سکا۔ سوگوار چہرے سے اُس کو دیکھتا رہا اور جب وہ بیٹھ گئی تو خود بھی بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ گھر آکر گاڑی سے اُترتے ہوئے موہنی نے دیکھا کہ ہر طرف خاموشی اور اندھیرا تھا۔ صرف اُس کے اپنے کمرہ میں نائٹ بلب جل رہا تھا۔ ماں اور اوِیناش سو گئے تھے شائد۔ چلو اچھا ہوا۔ اُس نے سوچا۔ ورنہ کیا سوچتے وہ اُس کو ڈاکٹر کے ساتھ دیکھ کر۔ اور ایک گہری اطمنان کی سانس لے کر دبے پاؤں وہ اپنے کمرہ کی طرف چلی گئی۔ ڈاکٹر نے گاڑی گیرج میں کھڑی کی۔ پھاٹک بند کیا اور وہ بھی اپنے کمرہ میں چلا گیا۔

صبح کو موہنی بستر سے اُٹھی تو اُس سے کھڑا نہیں ہوا گیا۔ بڑی ہمت

کرکے باہر تک آئی تو ایک جگہ چکرا کر گرنے لگی اور دیوار کا سہارا لے لیا اوینا ش نے دور سے اُس کو اس حالت میں دیکھا تو دوڑ کر آیا اور جب وہ اُس کو پکڑ کر کمرہ میں لے جا رہا تھا' اس نے محسوس کیا کہ بدن اُس کا گرم ہو رہا ہے۔

"ارے تمہیں آج پھر بخار ہو گیا دیدی۔ کیا ہوا یہ؟ اب تو تم ٹھیک چل رہی تھیں دوا چھوڑ دی ہے کیا؟"

"نہیں تو۔ برابر لے رہی ہوں دوا تو۔"

"تو پھر کیا بات ہے؟" وہ سوچ میں پڑ گیا اور پھر اُٹھ کر کمرہ سے نکل گیا۔

رات بھر موہنی سوچتے سوچتے نڈھال ہو گئی۔ تھوڑی بہت دیر کو سوئی بھی تو ڈاکٹر ہی کے خواب نظر آتے رہے اور نتیجہ ظاہر تھا۔ اب کچھ دن سے وہ بہتر نظر آ رہی تھی۔ چہرہ پر رونق معلوم ہوتی تھی ماں اور اوینا ش بھی کچھ مطمئن ہو چلے تھے لیکن آج پھر وہی اُلجھن تین دن اسی حالت میں گذر گئے۔

آج چوتھے دن وہ کچھ ٹھیک معلوم ہوئی تو ماں اُس کو ساتھ لئے ہوئے لان میں آ کر بیٹھیں اور شامو ہیں شام کی چائے لے آیا۔ چائے پیتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھ کر موہنی نے کہا۔

"آج اوینا ش نظر نہیں آ رہا ہے ماں۔ کہاں ہے وہ؟"

"وہ رات انبالہ گیا ہے بیٹی۔"

"کیوں؟"

"وہ ایسا ہے کہ میری بھتیجی منجھلیش ہے نا وہاں۔ تو کل اُس کی چٹھی آئی تھی۔ اُس کے بچّے کی سالگرہ ہے۔ چار سال کے بعد یہ بیٹا پیدا ہوا تھا اُس کے یہاں۔ میں نے کچھ کپڑے بھی اُس کے لئے تیار کر کے رکھے تھے وہ بھی بھیجے ہیں اوینا ش کے ہاتھ۔"

"ارے! مجھے نہیں بتایا۔ میں بھی چلی جاتی اُس کے ساتھ۔ مجھے گھر چھوڑ کر آگے چلا جاتا۔ بتائیے اب کس کے ساتھ جاؤں گی میں" وہ رہانسی ہوکر بولی۔

"ایسی حالت میں کیسے جاتیں بیٹی۔ بخار تو ہو گیا تھا تمہیں۔ اسی لئے تو وہ بتا کر نہیں گیا۔ کہہ رہا تھا دیدی کو پتہ نہ چلے۔ کبھی وہ جانے کی ضد کریں اور ٹھیک بھی ہے۔ پہلے علاج تو پورا ہو جائے تمہارا۔ کچھ اچھی ہو چلی تھیں کہ پھر بخار نے آگھیرا۔"

"وہ تو ویسے ہی ہو گیا تھا ماں۔ اب تو میں بالکل ٹھیک ہوں۔ اتنے دن سے لکشمی کی چھٹی بھی نہیں آئی۔ نہ جانے وہ لوگ کیسے ہوں۔ میرا جی بہت گھبرا رہا ہے ماں۔ میں تھوڑے دن وہاں رہ کر پھر آجاتی۔"

"ابھی کس طرح جاؤ گی بیٹی؟ اور چھٹی بھی آجائے گی وہاں سے وہ لوگ ٹھیک ہی ہوں گے تم دھیرج تو رکھو۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن اویناش آجائے گا تو مجھے کبھی نہیں جانے دیگا اگر آپ کہیں تو میں کل شامو کے ساتھ چلی جاؤں۔"

"ہاں ہاں چلی جانا۔ بلکہ میں خود لے کر جاؤں گی تمہیں اپنے ساتھ۔ اتنی جلدی کیا ہے؟"

اور وہ اتنا ہی کہہ پائی تھیں کہ ایک ٹیکسی تیزی سے پھاٹک میں داخل ہوئی اور ذرا آگے آکر رُک گئی۔ دونوں نے ایک ساتھ پلٹ کر اُدھر دیکھا اور موہنی کو تو جیسے بجلی کا جھٹکا سا لگ گیا۔ مبہوت سی پہلے تو اِدھر اُدھر دیکھتی رہ گئی پھر کھڑی ہوئی۔ چلنا چاہا تو قدم جیسے کسی نے پکڑ لئے ہوں۔ ناچار وہیں کھڑی رہ گئی۔ ماں بھی اُٹھ کر کھڑی ہو گئیں اور حیرت سے آنے والے کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔

"کون ہو سکتا ہے یہ؟ سریندر تو گھر پر ہیں بھی نہیں۔"

"آداب عرض ہے۔" آنے والے نے قریب آکر بڑے ادب کے ساتھ ماں کو آداب کیا۔

"آداب عرض۔" ماں نے جواب میں کہا۔

"کہئے کہاں ہیں ڈاکٹر صاحب؟" اور یہ کہتے ہوئے خالی کرسی کی طرف نظر اٹھا جس کے پاس ہی موہنی خجل اور شرمندہ سی سر نیچے جھکائے کھڑی تھی۔

"ارے موہنی آپ؟" بڑی طرح چونکتے ہوئے اُس کے منہ سے نکلا۔ اور کرسی کے لئے بڑھا ہوا ہاتھ نیچے آ گیا۔

"کیا عجیب اتفاق ہے۔" پھر اُس نے کہا۔ "یعنی یہ بات سوچی بھی نہیں جا سکتی تھی کہ آپ..... آپ۔" اور وہ خاموش کھڑا رہ گیا۔

"بیٹھئے تو آپ۔" ماں نے اپنی کرسی اُس کی طرف بڑھائی اور شامو سے دوسری کرسی لانے کو کہا۔

شامو خود ہی ایک کرسی اُٹھائے بھاگا چلا آ رہا تھا۔ اور جب وہ کرسی پر بیٹھ گیا تو ماں کی طرف دیکھ کر بولا۔

"آپ شائد....."

"جی میں سریندر کی ساس ہوں۔"

"جی جی میں سمجھ گیا تھا۔ تو کہاں گئے ہیں وہ حضرت؟"

"معلوم نہیں کہاں چلے گئے۔ آتے ہی ہوں گے آپ اطمنان سے بیٹھئے" اور شامو سے چائے کے لئے کہہ کر وہ اپنی کرسی پر بیٹھ گئیں۔ اور موہنی کو دیکھتے ہوئے بولیں۔

"بیٹھ جاؤ بیٹی تم بھی کھڑی کیوں رہ گئیں۔" اور "آپ کیا پہلے سے جانتے ہیں موہنی کو۔" اُنہوں نے پلٹ کر آنے والے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں میں ان کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ بتاؤں گا ابھی۔ لیکن میں آپ کو تو یہ بتا دوں کہ میں کون ہوں۔"

"ضرور بتائیے" ماں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مجھے سعید کہتے ہیں۔ سعید رضوی۔ میں سہارنپور سے آیا ہوں اور یہ کہ.... بس۔ بس میں سمجھ گئی اور اچھی طرح سمجھ گئی۔ آپ سریندر کے دوست ہیں وہ آپ کا بہت ذکر کرتے رہتے ہیں اور بڑا پیار ہے اُن کو آپ سے آپ شائد پچھلے ہفتہ آئے تھے۔ میرے لڑکے نے بتایا تھا۔"

"جی آیا تھا لیکن ذرا جلدی میں تھا اس لئے اندر نہ آسکا۔"

"لو آگئے سریندر بھی۔" گاڑی کے ہارن کی آواز سُن کر ماں نے کہا۔ سعید نے بھی مسکراتے ہوئے پھاٹک کی طرف دیکھا اور ماں سے بولے۔

"آگئے واقعی۔ آپ نے ہارن کی آواز خوب پہچانی ماں جی۔ اُس نے خوش ہو کر کہا اور پھر دونوں دوست بے قراری سے ایک دوسرے کی طرف بڑھے اور بغل گیر ہو گئے۔

"بہت دن بعد خیال آیا ہمارا ـــ" سریندر نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کیا کریں۔ فرصت بھی ملے کہیں۔ اب تمہاری طرح تو ہیں نہیں کہ ہاسپٹل سے آگئے اور سیر سپاٹے کرتے پھرے۔ ہم جم کر نہ بیٹھیں گے تو کام کیسے چلے گا۔ پیٹ کیسے بھریں گے۔ بتاؤ؟"

"جی ہاں۔ ابھی سے اکیلے پیٹ کا بڑا خیال ہونے لگا۔ جورو نہ جاتا اللہ میاں سے ناتا۔ چار دن کے لئے فرصت نہیں نکال سکے۔"

"ارے میں اکیلا ہوں۔ کیا کہا۔ بھئی ماں باپ اور دو بہن بھائی تو رکھتا ہوں بھیّا۔"

"تو وہ تمہارے اوپر ہی بیٹھے ہیں کیا؟"

اور اسی طرح کی باتیں کرتے ہوئے دونوں اندر ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔ ماں اُٹھ کر رسوئی کی طرف چلی گئیں اور موہنی اپنے کمرہ میں جاکر لیٹ گئی۔

"اور سُناؤ بھیّا۔ شادی وادی کا کیا پروگرام ہے۔ بہت آزاد پھر لئے
ابتو۔" سریندر نے اطمینان سے بیٹھ کر سعید کو چھیڑا۔
"ہو جائے گی شادی بھی۔ جلدی کیا ہے اور اُس کے لئے ہمیں کیا سوچنا
پڑا ہے امّی اور ابّا جانیں۔ وہی لوگ ارمان میں دبلے ہوئے جاتے ہیں۔"
"کوئی لڑکی وڑکی بھی دیکھی امّی نے یا نہیں ابھی تک؟"
"لڑکی دیکھنے کی ضرورت کہاں ہے۔ امّی اپنی بھتیجی کو چھوڑ سکتی ہیں
بھلا تم تو جانتے ہی ہو۔"
"اچھا تو کیا آسیہ سے ہی ...."
"بالکل!" اُن کا بس چلے تو آج اُس کو لے آئیں جا کر۔"
"تو لے کیوں نہیں آتیں۔" سریندر نے چائے پیالیوں میں نکالتے
ہوئے کہا۔
"لائیں تو جب نا! جب اُن کے بھیّا لانے دیں۔"
"وہ کیا کہتے ہیں؟" سریندر نے پیالی اُسکی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔
"اُن کی وہی ایک رٹ ہے کہ جب تک کافی جہیز نہ ہوگا وہ لڑکی کو
رخصت نہیں کریں گے۔ وہی پرانی زمینداری کی للک۔ کنگال ہو گئے مگر آن
نہیں گئی۔ امّی تقاضا کرتی ہیں تو ناراض ہو جاتے ہیں۔ کہتے ہیں تم ہماری توہین
کرتی ہو کہ جہیز کے جھمیلے میں نہ پڑیں۔ تم غریب بھائی کی عزّت اُچھالنا چاہتی ہو۔
اب کون سمجھائے اِن پرانے دماغوں کو اور ہاں بھئی ایک بات تو بتاؤ۔"
سعید نے کرسی پر سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے کہا۔
"یہ موہنی یہاں تمہارے یہاں کیسے؟"
"تم جانتے ہو اِسے؟" سریندر نے چونکتے ہوئے کہا۔
"ارے جاننا کیا۔ میں نے علاج کیا ہے اِس کا بھئی۔ میری ڈسپنسری
کے قریب ہی تو رہتے ہیں منشی دینا ناتھ جی۔ یعنی اس لڑکی کے باپ بڑے

شریف انسان ہیں لیکن قسمت کے بڑے کچے ہیں بے چارے بڑا ہی زبردست المیہ ہوا ہے اُنکے ساتھ۔"

"وہ مجھے معلوم ہے سب۔" سریندر بیچ میں ہی بول پڑا اور شروع سے آخیر تک پوری بات اُس کو سنا کر خاموش ہو گیا۔

"اوہ مجھے تمہاری شرافت سے یہی امید تھی سریندر! تم تو میری توقع سے بھی کہیں بلند نکلے میرے دوست۔ میں نے دینا ناتھ جی سے ایک دن تمہارے بارے میں ذکر بھی کیا تھا اور سچ پوچھو تو میں بہت دن سے اسی کوشش میں تھا کہ جلد سے جلد تم سے مل کر بات کرلوں لیکن کوئی نہ کوئی اڑچن سامنے آتی رہی اور میں یہاں نہ آسکا۔ اور۔"

"وہ تو ہے ہی۔" سریندر نے پھر بات کاٹی۔ "لیکن یہ لڑکی تو ....."

"وہ کچھ نہیں۔" سعید نے کہا۔ "اُس کی بات ایسی ہے کہ وہ شریف اور حسّاس لڑکی ہے اور احساسِ کمتری کا شکار بھی۔ ویسے اُس کا یہ سب سوچنا فطری بھی ہے۔ ٹھیک ہو جائے گی۔ میں اُسے سمجھا دوں گا سب اور ہاں وہ تو میں نے تمہیں بتایا ہی نہیں۔ بڑا افسوس ہے اُس کا بھی واقعی۔"

"کیا؟" سریندر نے اُس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

"وہ اُن کی چھوٹی لڑکی ہے نا! لکشمی، اُس کی سگائی بھی ٹوٹ گئی۔"

"ارے! سریندر نے بڑے افسوس بھرے لہجہ میں کہا۔ "لیکن وجہ؟"

"وجہ کیا ہوتی۔ اُن لوگوں نے سوچا ہو گا کہ بھائی تو رہا نہیں منشی دینا ناتھ بیٹی کو کیا دے دِلا سکیں گے۔ بس اسی لئے اِنکار لکھ بھیجا۔"

"اُف! دنیا میں کیسے کیسے لوگ ہیں سعید! جن کے دِل میں ذرا بھی رحم نہیں۔"

"ہاں بس خدا ہی سمجھے ایسے لالچی لوگوں سے۔"

"اب کیا ہو گا؟" سریندر بہت رنجیدہ ہو گیا تھا۔ "منشی صاحب

ٹھیک تو ہیں نا؟"

"کہاں ٹھیک ہیں۔ کمزور سے تو آدمی ہیں۔ بیمار پڑ گئے تھے غریب بیچارے بہت سمجھانے بجھانے اور حوصلہ دلانے پر اب کچھ بہتر ہو گئے ہیں۔"

وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ قریب کے کمرہ سے کسی کے گرنے اور کسی چیز کے گر کر ٹوٹنے کی آواز سے دونوں ہی چونک کر کھڑے ہو گئے اور پردہ ہٹا کر کمرہ میں جھانکا تو موہنی کو نیچے فرش پر گرا ہوا پایا۔

"ارے!" دونوں کے مُنہ سے ایک ساتھ نکلا اور تیزی سے آگے بڑھ کر دونوں اُس پر جُھک گئے۔

"بے ہوش ہو گئی ہے" سریندر نے وہیں اُس کے پاس بیٹھ کر اُسکو دیکھتے ہوئے کہا اور آہستہ سے اُٹھا کر اویناش کے بستر پر لٹا دیا اور سعید سے مشورہ کر کے ایک انجکشن تیار کرنے لگا۔

موہنی اُس وقت تو اپنے کمرہ میں جا کر لیٹ گئی لیکن اُلجھن اُس کی کسی طرح کم ہونے میں نہیں آرہی تھی جب سے سعید کو دیکھا تھا۔ یکایک لیٹے لیٹے خیال آیا کہ اویناش کے کمرہ کا دروازہ ڈرائنگ روم میں کھلتا ہے۔ اُس نے سوچا کہ پردے کے پاس جا کر سُننا چاہیئے کہ میرا ذکر یہ لوگ کِس طریقہ سے کریں گے اور دبے پاؤں وہ یہاں آکر کھڑی ہوگئی۔ لکشمی کی منگنی کے ٹوٹنے کی اور اپنے باپ کی بیماری کی بات جب آئی تو اُس سے برداشت نہ ہو سکا اور پھر اُس کو پتہ نہیں چلا کہ کیا ہوا اور جب اُس کی آنکھ کھلی تو ماں اُسکے پاس بیٹھی تھی۔ سریندر سامنے خاموش کھڑے تھے اور سعید اُس کے اوپر جُھکے ہوئے بڑی محبت سے پوچھ رہے تھے۔

"موہنی بہن کیسی ہیں آپ اب؟"

اُس نے آنکھیں اُٹھا کر اُن کے چہرے کی طرف دیکھا اور پھر اُسے وہی سب یاد آنے لگا اور آنسو اُس کی آنکھوں سے بہہ بہہ کر تکیہ میں جذب ہونے لگے۔

"ارے آپ تو بڑی کم ہمّت نکلیں۔ ہم تو آپ کو بہت بہادر سمجھتے تھے۔ واہ بھئی واہ" اور اُن کا اتنا کہنا تھا کہ وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر باقاعدہ سسکیاں لینے لگی۔ کچھ دیر بعد سعید نے اُس کا ہاتھ ہٹایا اور پاس پڑے ہوئے تولیہ سے اُس کے آنسو پونچھتے ہوئے بولے۔

"دیکھئے بھئی روئیے نہیں اب ورنہ ہم سب بھی رو پڑینگے آپکے ساتھ۔" اور اِسی طرح کی باتوں میں وہ اُس کو بہلانے کی کوشش کرنے لگے اور جب وہ کچھ بہتر نظر آئی۔ تو دونوں کمرہ سے باہر چلے گئے۔

"ماں جی۔" اُن کے جانیکے بعد موہنی نے ماں کی طرف بدلتے ہوئے کہا۔

"کیا ہے بیٹی؟"

"میں گھر جاؤں گی ماں۔" اُس کی آواز پھر بھرّا گئی۔

"اچھا تو کل چلنا۔ سعید بھی کل ہی جانے کے لئے کہہ رہے ہیں بس اُنکے ساتھ ہی ہم دونوں بھی پنکی کو لے کر چلے چلیں گے۔ ویسے تو وہ رکتے ابھی لیکن تمہاری وجہ سے وہ بھی ہمارے ساتھ چلنے کو کہہ رہے ہیں۔ دیکھو سریندر بھی مان جائیگا شائد اور نہ مانے تو اُن کو سمجھا دوں گی۔ تم اطمینان رکھو۔"

"اچھا اب تم خاموشی سے آنکھیں بند کر کے لیٹ جاؤ۔ بولو نہیں۔ بولنے کے لئے منع کیا ہے تمہیں۔ اور وہ بھی اُٹھ کر باہر چلی گئیں۔

اگلے دن موہنی اور ماں ڈاکٹر سعید کے ساتھ سہارنپور کے لئے روانہ ہو گئیں۔

آہا! موسی ہ۔ ماں دیکھو تو کون آیا ہے۔ مدھو نے خوش ہوتے ہوئے ماں کو پکارا۔

"کون ہے؟" اُس کی ماں شانتی دیوی رسوئی سے نکل کر آگے بڑھیں اور بہن پر نظر پڑتے ہی، ارے جیجی آگئیں یہ تو۔ کہتی ہوئی اُس سے بغل گیر ہوگئیں۔

"اور نہ آتی ہیں۔ اپنے شوکی کے بیاہ میں بھی نہ آتی کیا؟" بڑھیا بولی۔ اور بہن سے الگ ہوتے ہوئے پیچھے کھڑی بملا کو غور سے دیکھتے ہوئے اُس کی موسی نے کہا۔

"یہ بملا کیسی ہو گئی۔ اری تجھے کیا ہوا بیٹی!" اور ایک قدم آگے بڑھ کر اُنہوں نے اُس کو بھی گلے سے لگا لیا۔ اُدھر راجیشوری یعنی پرکاش کی ماں مدھو کو چپٹائے کھڑی تھی۔ بملا کو چھوڑ کر شانتی دیوی بہن کی طرف مڑیں۔

"جیجی!" پرکاش نہیں آیا کیا؟ اور جیجا جی۔

تیرے جیجا آجاتے تو گھر پر کون رہتا اور پرکاش ہے۔ وہ کیسے نہ آتا باہر ہوگا اور کوئی دو منٹ بعد ہی اشوک اُس کا ہاتھ پکڑے ہوئے دروازے سے آتا ہوا نظر آیا۔ پیچھے اُس کا چھوٹا بھائی انوپ بھی تھا۔

"ماں! پرکاش" اُس کے دونوں کندھے پیچھے سے پکڑ کر اشوک نے اُس کو ماں کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"یہ پرکاش ہے؟ نہیں تو۔"
"اور کون ہے۔" اشوک ہنسنے لگا۔
"ہائے کیسا بدل گیا یہ۔ ہڈیاں ہی ہڈیاں رہ گئیں۔ ماس کا نام نہیں۔"
اُس کو اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے اُنہوں نے بڑے افسوس سے کہا۔
"یہ تو پاگل ہو گیا ہے۔ کیا کرے کوئی اِس کا۔" اس کی ماں نے ذرا ترشی سے کہا۔
"ایسا نہ کہو جیجی۔ ایک ہی تو بچّہ ہے پھر ایسے نیک اور سیدھے سادے لڑکے کہاں ہوتے ہیں آج کل۔ تم بھی نہ جانے کیسی ہو۔"
اور اُنہوں نے بڑی محبّت سے اپنے پاس ہی چارپائی پر بٹھا لیا اور سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ کچھ کہنے ہی والی تھیں کہ اُن کے پتی گوپال بابو ہنستے ہوئے گھر میں داخل ہوئے اور سب سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔
"اری بھاگیہ وان بس بھانجے سے چپکی بیٹھی ہے اور وہ جو بہن اور بھانجی بیٹھی چپ چاپ تجھے دیکھ رہی ہیں، اُن کی پرواہ نہیں۔" وہ مسکرا کر بیوی سے بولے۔
"تمہیں کیا چنتا پڑ گئی۔ سب مل لئے سب سے۔ بس آئے اُلٹی سیدھی ہانکنے کو۔"
"ارے اُلٹی کیسی۔ میں تو سدا سیدھی ہی ہانکتا ہوں۔ دیکھو ذرا اپنی بہن کو تو دیکھو۔ بچّوں کو تو شائد کھانے کو دیتیں نہیں کچھ۔ لگتا ہے کہ بچّوں کے حصّے کا بھی خود ہی کھا جاتی ہیں جب ہی تو کیسی موٹی ہو رہی ہیں۔"
"ہوں!" وہ بھی تلملا کر بولی۔ "تم بھی میری بہن سے چھین کر کھا جاتے ہو گے جب ہی تو یہ سوکھ رہی ہے اور تم پھول کر کُپّا ہو رہے ہو۔"
"ارے تم سے تو کم ہی ہوں میں۔ آؤ ذرا مل کر کھڑی ہو جاؤ دیکھیں کون موٹا ہے زیادہ۔"

"جاؤ جاؤ۔ بھیّا تم تو بڈّھے ہو گئے مگر باتیں نہ گئیں اور اب تو سٹھیا بھی رہے ہو۔"

"ہوں! تم بُڈھیا ہو گئیں تو سب ہی بڈّھے نظر آنے لگے۔ کون کہتا ہے میں بوڑھا ہو گیا میں تو ساٹھا سو پاٹھا ہوں۔"

"ہاں۔ ہاں۔ تم تو بالکل جوان ہو۔"

"وہ تو ہوں ہی اور پھر ہنستے ہوئے وہ پرکاش کی طرف دیکھ کر بولے۔"

"ہاں بھئی پرکاش۔ تو تو بالکل ہیلتھ آفیسر ہو گیا بیٹا۔ اور یہ لڑکی بھی تو کیسی کمزور ہو گئی بملا۔ بھئی میری مانو تو اپنی ماں سے چھین جھپٹ کر کھایا کرو ایسے یہ دینے والی نہیں۔"

"ارے یہ بچّے ایسے کہاں ہیں۔" ان کی بیوی نے ان کی بات پوری نہ ہونے دی۔

"اور یہ پرکاش تو اتنا سیدھا اور ایسا لائق ہے یہ تو ماں باپ کے آگے بولا ہی نہیں کبھی۔"

"یہی تو ٹھیک نہیں۔ آج کل ایسے سیدھے آدمی کو لوگ کچھ اور بھی کہتے ہیں۔" وہ زور سے قہقہہ لگا کر بولے اور قبل اِس کے کہ وہ اور کچھ کہیں مدھو سب کو کھانے کے لئے بُلانے آ گئی اور کھانے کے کمرہ میں سب ہی جمع ہو گئے آ کر۔ مدھو کے ساتھ ایک نئی لڑکی کو کھانا لا لا کر رکھتے ہوئے سب ہی نے دیکھا لیکن کوئی کچھ بولا نہیں۔ سوائے پرکاش کی ماں کے جو کچھ دیر آنکھیں پھاڑ کر اُسے دیکھتی رہی اور پھر بہن کی طرف جُھک کر ذرا دھیمی آواز سے بولی۔

"یہ لڑکی کون ہے شانتی؟"

"کون یہ؟ چنچل ہے۔ مدھو کی نند۔ مدھو کے ساتھ آئی ہے۔"

"اچھا۔ کیسی سندر لڑکی ہے۔"

"کیا چنچل کو پوچھ رہی ہو جیجی۔ اُس کے بہنوئی چنچل کا نام سُنکر بولے۔

"یہ چنچل بڑی چنچل بڑی تیز ہے اپنے نام کی طرح۔ کیا پوچھتی ہو اس کو بتاؤں گا اِس کی باتیں تو تمہیں۔"

"چاچا جی!" چنچل ذرا سا تلملائی اور ان کو گھورتے ہوئے مدھو کے کان میں بولی۔

"میں جا رہی ہوں بھابی۔" اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"ارے چلی کہاں مجھ سے بچ کر کہاں جائے گی۔ پکڑ نہ لاؤں گا تجھے۔ سمجھتی کیا ہے اپنے کو۔"

"چُپ بھی رہو بھیّا۔ کیوں چھیڑتے ہو بے چاری کو۔" وہ شرما کر جانے ہی لگی تھی۔

"بیٹھ جا بیٹی۔ یہ تو ایسے ہی ہیں سدا کے جیبو۔" پرکاش کی ماں نے اُس کے اوپر ذرا پیار جھاڑتے ہوئے کہا۔

"یہ جیبو کیا ہوتا ہے موسی؟" اُس کا چھوٹا بھانجا انوپ ہنستے ہوئے بولا۔

"ارے جیبو وہ ہوتا ہے بیٹا جس کی جیب زیادہ چلے۔"

اور گوپال بابو کچھ کھسیانی سی ہنسی کے ساتھ خاموش ہو کر کھانا کھانے میں لگ گئے۔

رات کو کھانے کے بعد سب صحن میں نکل کر بیٹھے۔ بیچ صحن میں فرش بچھایا گیا اور لڑکیاں گانا گانے بیٹھیں۔ کوئی دس بارہ لڑکیاں جمع ہو گئی تھیں تھوڑی ہی دیر میں مدھو اور چنچل کے آ کر بیٹھنے کے بعد گانے کی تیاری شروع ہو گئی۔ چنچل کو بیٹھتے ہی گھونگرو دیا د آئے۔ وا اٹھلاتی ہوئی اندر گئی اور بڑے انداز سے گھونگرو دونوں ہاتھوں میں اُچھالتی اور پیروں کو ناچنے کے انداز میں حرکت دیتی ہوئی آ کر بیچ میں بیٹھ گئی۔ گانے چونکہ لگن کے دن سے ہی شروع ہو گئے تھے اس لئے سب کے بیٹھنے کی جگہ مقرر تھی۔ ڈھولک بجانے والی لڑکی نے بھی اپنی جگہ سنبھال رکھی تھی۔ گانے زیادہ تر چنچل ہی

نکالتی تھی اِس لیئے وہ ڈھولک کے پاس ہی بیٹھتی تھی۔ مدھو ایک لڑکی سے باتیں کرتے کرتے چنچل کی جگہ پر تھوڑی کھسک آئی تھی۔ چنچل آئی اور اُس کے پیچھے بیٹھ کر اُس کو جھٹکے سے کچھ اِس طرح آگے کو کیا کہ وہ انجانے میں دوسری لڑکی کے اوپر جا پڑی۔

"دماغ تیرا ٹھیک ہے چنچل۔ مجھ سے کہتی تو ــــ میں آپ ہی اُدھر ہٹ جاتی۔

"دماغ تم اپنا دیکھو بھابی۔ ایک تو میری جگہ پر ادھیکار جما کر بیٹھ گئیں اوپر سے بگڑ رہی ہو۔"

وہ لڑکی بھی بگڑ گئی جس کے اوپر مدھو گری تھی۔ وہ اصل میں کھسیانی سی ہو گئی تھی۔ بولی۔

"واہ بھئی واہ! اتنی زور سے میرے اوپر دھکّا دیدیا۔ یہ بھی کوئی بات ہے اسی لئے بُلاتی ہو گانے کو۔ ہم اب نہیں آئیں گے۔"

"دھکّا دیا تھا میں نے؟ ذرا سا آگے کو کھسکایا ہی تو تھا۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ وہ تیرے اوپر ہی جا پڑیں گی۔ اب لڑنے کی جی میں ہو تو ویسے ہی کہدو۔" چنچل اُلٹا اُسی کو نکوّ بنانے لگی۔

"چنچل!" مدھو نے اُس کو گھورا۔ "اب گائے گی بھی یا لڑے ہی جائے گی۔" پھر اُس لڑکی کی طرف مُڑ کر اُس نے کہا۔

"چُپ ہو جا پُشپا تو ہی۔ اِس کا تو بچپنا ابھی گیا ہی نہیں۔"

"واہ مدھو دیدی۔ تم بھی ایسی بات کرتی ہو۔ تم سہو اِس کی باتیں ہم سے کیا مطلب۔ اور ہم کون سے بوڑھے ہیں۔" پُشپا آہستہ سے بڑبڑائی۔

"ہو گا خیر چھوڑو۔" مدھو خوشامد سے بولی۔

"ہاں رانی تو ڈھولک تو شروع کر۔" اور بات آئی گئی ہو گئی۔

بڑی عورتیں دور بیٹھی تھیں۔ اُنھوں نے اپنی باتوں میں یہاں کا کچھ نہیں سُنا لیکن بملا قریب ہی بیٹھی سب دیکھ اور سن رہی تھی۔ اُس کو چنچل کی یہ حرکتیں اچھّی نہیں لگیں لیکن وہ کچھ بولی نہیں۔

رات کتنی ہی دیر تک اُس کی ماں چنچل کی تعریفیں کرتی رہی تھی مگر اُسکو پہلی نظر میں ہی وہ کچھ اچھّی نہیں لگی تھی۔ اتنی تیز۔ طرّار اور منھ پھٹ۔ وہ سر جھکائے سوچ ہی رہی تھی کہ چنچل نے ایک پھڑکتا ہوا فلمی گیت نکالا۔

"بھابی کی انگلی میں ہیرے کا چھلا"

"یہ نہیں چنچل" مدھو بولی "یہ تو ناچ پر چلے گا۔ پہلے ایک بنّا گالیں یہ والا:-

نجریا لاگی سکھی میرے بنرے کو

"تم تو ہر بات میں کاٹ کرتی ہو بھابی۔ مجھے یہ سڑے بُسے گیت ذرا نہیں بھاتے تم ہی گالو پہلے اِس کو۔ میں نہیں گاؤں گی" اُس نے جگہ چھوڑتے ہوئے کہا۔

"تو تو بگڑ جاتی ہے بے بات ہی۔ پہلے بڑی عورتوں کی پسند کا ایک ہو جائے تو اچھّا ہے۔ خوش ہو جائیں گی وہ بھی۔ ابھی کسی نے کہا بھی تھا بنّا گانے کو" مدھو نے تجویز رکھی۔

"تو کون منع کرتا ہے بُڈھیوں کو ہی خوش کرلو پہلے" اور وہ پیچھے ہٹ آئی اور ڈھولک والی لڑکی نے وہی شروع کر دیا۔ عورتوں کی باتیں وہیں ختم ہو گئیں اور سب مُسکرا مُسکرا کر اُدھر ہی دیکھنے لگیں۔ پرکاش کی ماں نے بھی چشمہ درست کیا اور اُس طرف کو آنکھیں اور رانی کو غور سے دیکھ کر بہن کے کان میں کُھسر پُھسر شروع کر دی۔

"یہ ڈھولک والی لڑکی کون ہے؟"

"یہ پڑوس کے شیام سنگھ جی کی لڑکی ہے جیجی۔ مدھو کے ساتھ

کی پڑھی ہوئی ہے۔"

"کیا پڑھی ہے؟"

"بی۔ اے۔ کیا تھا مدھو کے ساتھ ہی۔ سہیلی ہے اُس کی۔"

"اچھّی صورت کی ہے پر دھوتی بہت تڑک بھڑک کی پہنے ہے اور بال یہ کس طرح کے بنا رکھے ہیں؟ فیشن میں بہت آگے معلوم دے ہے۔ بلاوز بھی بے بانہہ کا دیکھے ہے۔"

"بے بانہہ کا تو نہیں ہے۔ آستین چھوٹی ہے ایسے تو آج کل سبھی لڑکیاں پہنے ہیں۔"

"کون لوگ ہیں؟"

"برادری کے ہی ہیں۔"

"اور کام کیا ہوتا ہے اِن کے یہاں۔"

"معمولی ہی آدمی ہیں جیجی! پِتا اِس کے کلرک ہیں۔ چار ساڑھے چار سو مل جاتے ہوں گے بیچارے کو۔"

اچھّا؟" پرکاش کی ماں نے ایکدم بجھتے ہوئے کہا۔" اور اتنے پر بیٹی کو میم بنا رکھا ہے۔"

"میم ویم کہاں بنا رکھا ہے جیجی۔ یہ تو وقت کا چلن ہے۔ جس رنگ میں سب ہوں اُسی میں رہنا پڑتا ہے۔ ہمارے سمے میں جو ڈھنگ تھا پہننے اوڑھنے کا، ہم وہی تو کرتے تھے اسی طرح یہ لڑکیاں بالیاں بھی اپنے زمانے کے فیشن کا پہنتی اوڑھتی ہیں۔ ہاں بے حیائی کپڑے نہیں ہونے چاہیں۔ پر تم یہ سب کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"ارے وہی پرکاش کے لئے سوچ رہی ہوں کہ کوئی اچھّی سی لڑکی مل جائے تو اُس پہلی والی کا پاپ کاٹ کر اِس کا گھر بسا دوں۔ بالکل چُپّا ہو کر رہ گیا ہے کسی بات کی سُدھ ہی نہیں رہی۔ اس کا بیاہ ہو جاوے کوئی

بال بچے گھر میں ہو تو کچھ پتہ تو چلے کہ کوئی ہے۔ سنّاٹا سا پڑا رہے ہے بملا کو الگ چُپ لگ گئی ہے۔"

"او ہو۔ یہ بات ہے پر جیجی ایک بات کہوں تم بُرا نہ مانو تو۔" اشوک کی ماں نے کچھ جھجکتے ہوئے کہا۔

"نہیں تو کہہ۔ تیری بات کا کیا بُرا مانوں گی۔"

"بات یہ ہے کہ میری مانو تو۔ تو موہنی کو ہی لے آؤ جا کے۔ اُس جیسی لڑکی تمہیں کہیں نہیں ملے گی۔ چھوٹے موٹے گھر دیکھو گی تو لینا دینا تمہاری پسند کا نہیں ہو گا اور جہاں لینا دینا اچھا ہو گا وہاں لڑکی کالج کی پڑھی فیشن ایبل تیز اور نخرے والی ملے گی۔ وہ تمہارے کہنے پر نہیں چلے گی اپنے من کی کرے گی اور پتی کو بھی اِس طرح مٹھی میں لے لے گی کہ وہ تمہارا نہیں رہے گا پر جیجی تم دیکھنا وہ اُس کو اِس طرح بولنا سکھا دے گی کہ تم سب گونگے ہو کر رہ جاؤ گے اور زیادہ بات بڑھی تو اُس کو لے کر الگ ہو جاؤ گی۔"

"وہ تو خیر ہے پر موہنی اب کیسے آسکتی ہے۔ اب تو طلاق کی بات چل رہی ہے بہت دن سے اور تیرے جیجا تو اب بالکل پکے ہیں طلاق کے لئے۔ اُدھر اُس کا باپ بھی جلدی کر رہا ہے بہت اور اُس بیمار کو لا کر کروں گی بھی کیا وہ ہے کس کام کی اوپر سے چلتے سمے میرے ساتھ بہت زبان چلا کر گئی تھی وہ میرا تو دل پھٹ گیا ہے اُس سے۔ میں تو اب جانے کی نہیں اُس چوکھٹ پر۔"

"پھر تم جانو۔" شانتی دیوی کے لہجہ میں کچھ ترشی گھلی ہوئی تھی۔

"میں نے تو جو سچ بات تھی وہ تم کو بتا دی۔ میرے وچار اور ہیں تمہارے اور مگر اتنا میں ضرور کہوں گی جیجی کہ تم نے اُس کے ساتھ اپنے بچے کا جیون بھی برباد کر دیا۔ خیر چھوڑو اِس بات کو۔" اور وہ رُخ بدل کر لڑکیوں کے گانے کی طرف متوجہ ہو گئیں بغیر یہ دیکھے ہوئے کہ اُن کی بات کا اُن کی

بہن پر کیا اثر ہوا۔ کیونکہ وہ اِس وقت بات کو بڑھانا نہیں چاہتی تھیں۔ راجیشوری اُن کی بہن بھی چہرے پر ناگواری لئے ہوئے بادِل ناخواستہ اُدھر ہی کو مُنہ کر کے چُپ بیٹھ گئی۔

چنچل کسی فلمی ناچ گیت پر بالکل فلم والی عورتوں کی طرح مٹک مٹک کر اُچھل اُچھل کر بڑی تیزی سے ناچ رہی تھی اور ساتھ ہی آنکھوں کے اِشارے کچھ ایسی بے حیائی سے کرتی کہ بملا نے تو کئی بار شرم سے گردن جُھکا لی لیکن اُس کی ماں نے کچھ نہیں دیکھا۔ اُس کی نظر اُدھر ضرور تھی لیکن من کہیں اور تھا رات کے بارہ بجے تک یہی دھما چوکڑی مچی رہی۔ پھر سب سو گئے کیونکہ اگلے دن منڈھا تھا اور پوری برادری اور بھی ملنے جُلنے والوں کا کھانا تھا اور شام کے نمبر میں بھات وات کا چکر بھی تھا۔

اور اسی لئے رات کو تین بجے ہی سب نے بستر چھوڑ دیئے اور کام دھام میں مصروف ہو گئے۔ کوئی نو بجے کے قریب مدھو نے کپ میں چائے بنائی اور چنچل سے بولی۔

"چنچل! لے ذرا یہ چائے پرکاش بھیا کو دے آ۔ وہ اندر کمرہ میں موسی کے پاس بیٹھے ہیں۔"

"نہ بابا۔" چنچل کانوں پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ "میں اُن کے پاس نہ جاؤں اور چائے تو اُنہوں نے باہر پی لی ہوگی ناشتہ کے بعد۔"

"نہیں۔ وہ چائے جانے سے پہلے ہی اندر آ گئے تھے۔ جا دے آ ذرا!" وہ خوشامد سے بولی۔

"تم خود ہی دے آؤ نا!"

"تو ہی دے آئے گی تو کیا ہو جائے گا۔ میں ذرا کام کر رہی ہوں۔"

"مجھے تو انہیں دیکھ کر ہنسی آتی ہے بھابی۔ اگر میری ہنسی چھوٹ پڑی تو؟"

"کیوں؟ ہنسی کیوں آتی ہے؟" مدھو نے منہ بناتے ہوئے پوچھا۔
"نہ ہلیں نہ جُلیں نہ بات کریں۔ بس چپ بیٹھے بچوں کی طرح آنکھیں پھرا پھرا کر سب کو دیکھتے رہتے ہیں۔ میں نے تو اُنہیں بولتے دیکھا نہیں کسی سے بھی۔ سچ بھابی مجھے تو لگتا ہے کہ ان کے مُنہ میں زبان ہے ہی نہیں۔ وہ جو بے زبان کے لوگ مانگنے آتے ہیں نا جو کاغذ پر لکھا سب کو دکھا دیتے ہیں اور مُنہ کھول کر دیکھو تو زبان غائب۔ بس ایک گول گڈّھا سا ہوتا ہے اندر بالکل اِسی طرح تو نہیں تمہارے یہ پرکاش بھیّا؟" اُس نے مدھو کی طرف جھک کر ذرا دھیمے سے کہا اور زور سے ہنس دی۔
"چائے نہ لے جانی پڑے اِسی لئے باتیں بنا رہی ہے۔ چل میں خود دے آتی ہوں۔" مدھو نے بُرا مانتے ہوئے کہا۔ "دُکھی ہیں بیچارے اور کیا ہے۔"
"تو کس نے کہا اُنہیں دُکھی ہونے کو۔ کیوں ڈرتے ہیں اتنا ماں باپ سے جا کر لے کیوں نہیں آتے پتنی کو اپنی۔ تم بُرا مانو یا بھلا میں تو کہوں گی کہ اُلّو ہیں تمہارے بھیّا۔" اُس نے پھر ہنسنا شروع کر دیا۔ اور مدھو چڑ کر پیالی ہاتھ میں لئے جیسے ہی نکلی، بملا کواڑ کی اوٹ میں خالی پیالی ہاتھ میں لئے کھڑی سب سُن رہی تھی۔ مدھو اُسے اِس طرح کھڑے دیکھ کر ٹھٹک کر کھڑی رہ گئی۔ اُس کے پیچھے چنچل بھی نکل کر آئی اور بملا کو دیکھ کر پہلے تو سٹپٹائی پھر تیزی سے ایک طرف کو سرک گئی۔
"یہاں اِس طرح کیوں کھڑی ہو دیدی۔ آؤ۔" مدھو نے ہاتھ پکڑ کر اُس کو اندر لے جاتے ہوئے کہا۔
"یہ چنچل بدتمیز زیادہ ہے۔ تم اِس کی بات کا بُرا نہ ماننا دیدی۔ یہ بچپن سے ہی ایسی ہے۔ سب سے چھوٹی ہے نا اور اکیلی ہے۔ ماں باپ اور چاروں بھائی لاڈ کچھ زیادہ ہی کرتے ہیں اُس کے اوپر اِسی لئے بگڑ گئی ہے۔ یہاں بابوجی نے اِس کو اور سر پر چڑھا رکھا ہے۔"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" بملا نے آہستہ سے کہا اور اندر ماں کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

رات کو سونے سے پہلے جب اُس کی ماں نے اکیلے میں باتیں کرتے کرتے چنچل کا نام لیا تو وہ بُری طرح بھڑک اُٹھی۔

"تمہیں میں کیا کہوں ماں۔ اب تو تم نے اُس کا نام لیا تو لیا۔ آگے مت لینا کبھی میرے سامنے۔"

"کیوں کیا بُرائی ہے۔ کیسی سُندر تو ہے اور اچھّے بڑے آدمی ہیں۔ مدھو کتنی خوش ہے سسرال میں۔ کیسے بھاری بھاری گہنے پہنے ہے۔"

"ہر وقت یہ بڑا چھوٹا مت کیا کرو ماں مت کیا کرو۔" وہ بستر پر اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ "تم دیکھتیں نہیں کہ کتنی چکر مکر ہے یہ لڑکی اور لاڈ میں اتنی بگڑی ہوئی ہے کہ کسی کو نگاہ میں نہیں لاتی۔ مدھو کو ایسی ایسی سناتی ہے کہ بے چاری چُپ رہ جاتی ہے۔ کیا کرے۔ ہر ایک سے لڑنے کو ہر دم تیار رہتی ہے اور پھر بر کاش کی تو اتنی ہنسی اُڑاتی ہے کہ تم سُنو تو پتہ لگے ذرا۔ ہمارے یہاں تو ایک دن بھی اِس کا نباہ نہیں ہو سکتا۔ اور کل رات تم نے اُسے ناچتے نہیں دیکھا کس طرح سے ناچ رہی تھی۔

"نہیں نے دھیان سے نہ دیکھا۔" اُس کی نے جماہی لے کر کروٹ بدلی اور خاموش ہو گئی۔ اُسکے بعد وہ چادر سے منہ ڈھانپ کر سونے کی کوشش کرنے لگی کیونکہ اگلے دن بارات جانے والی تھی اس لئے سب کو ہی پھر سویرے سویرے اُٹھنا تھا۔

صبح کو مدھو بستر سے اُٹھ کر باہر نکلی تو چنچل آئی اور اُس کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹنے لگی۔

"کیا ہے چنچل۔ بات تو بتایا کر۔ کہاں لے جا رہی ہے؟"

"بھیّا بلا رہے ہیں شریمتی جی اور بڑے غصّہ میں ہیں۔" اُس نے

اٹھلاتے ہوئے کہا۔

"چل ہٹ! غصہ اُن کو آتا ہی نہیں کبھی۔ کہاں ہیں؟"

"اُدھر اُس کمرہ میں۔" اُس نے انگلی سے اشارہ کیا۔ "جس کا دروازہ باہر کی طرف کُھلتا ہے۔"

اور وہ پردہ ہٹا کر جیسے ہی کمرہ میں آئی، جگدیپ اُس کا پتی مُسکرا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

"اوہو! آج کتنے دن بعد دیوی جی کے درشن ہوئے ہیں۔ اس سے تو ہم گھر پر ہی پڑے رہتے تو اچھا تھا۔ ایک جھلک کے لئے بھی آنکھیں ترس گئیں۔" اور شرارت سے بناوٹی نشہ اپنی آنکھوں میں بھر کر اُسکی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے، اُس نے دونوں ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف اُسے کھینچنا چاہا۔

"ہوں۔ہوں۔ ہوش میں تو ہو۔ یہ کیا بے تکا پن ہے۔" اُس نے اپنے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔ "اُدھر سے بابوجی یا بھیا کوئی بھی اچانک آ گیا تو۔"

"کوئی نہیں آئے گا۔ وہ ابھی بستر میں ہی ہیں۔" اور اُس نے پردہ دروازے پر اچھی طرح سرکا دیا۔ دروازہ وہ پہلے ہی بند کر کے بیٹھا تھا۔

"اور اندر سے ہی کوئی آ گیا تو کیا ہوگا۔" مدھو نے اُس کو گھورا۔

"ارے آنے دو کیا دیکھے گا کوئی۔" اور اُس نے اُسکے ہاتھ پکڑ لئے۔

"نہیں۔ دیکھو مجھے یہاں یہ سب بالکل پسند نہیں۔"

"تو پھر ہم جاتے ہیں واپس۔"

"تمہاری مرضی۔" اور وہ بھی روٹھنے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے دروازے کی طرف مڑ گئی۔

"سنو!"

"کہئے۔" وہ رُک گئی۔

"پاپ منٹ کے لئے بھی نہیں ٹھہر سکتیں میرے پاس۔" آگے بڑھ کر اُس نے دونوں ہاتھوں میں اُس کا چہرہ لے کر اوپر اُٹھاتے ہوئے بڑے پیار سے کہا۔

"اتنے دن میں آج آئیں وہ بھی بُلانے پر خود سے تو کہاں دھیان آسکتا تھا ہمارا۔"

"لیکن ذرا یہ تو سوچئے شریان جی کہ میں اکیلی بیٹی اور اکیلی بہن ہوں ہر کام کی ذمہ داری میرے ہی اوپر ہے۔ ماں کو بہن ہی نہیں چھوڑتیں۔" اُس نے آہستہ سے اُس کے ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا۔

"ہاں یہ تمہاری موسی کیسی ہیں مدھو؟ اور اُن کا یہ لڑکا؟" کرسی پر بیٹھتے ہوئے اُس نے کہا۔" اشوک بھیّا نے رات ہی ان کے بارے بتایا تو ہنسی بھی آئی اور دُکھ بھی ہوا۔"

"ہنسی کیوں آئی؟" مدھو نے حیرت سے کہا۔

"ارے ہنسی کی بات نہیں تو اور کیا ہے۔ کوئی اتنا چُغد بھی ہوگا اِس زمانے میں جتنا تمہاری موسی کا یہ بیٹا ہے۔"

"چھوڑیئے۔ کیا کریں پھر۔ وہ تو ہیں ہی ایسے۔"

"نہیں میں ٹھیک کر دوں گا اس کو۔"

"اچھّا میں چلوں اب۔ بہت کام پڑا ہے۔ بابو جی کہہ رہے تھے کہ گیارہ بجے تک سب کو تیار ہو جانا چاہیئے بارات کے لئے۔" اور وہ چلنے لگی۔

"ایک بات سُنو مدھو۔ اچھّی سی ساڑی پہننا آج اور سنگار بھی ایسا ہو کہ بس" اُس نے شرارت سے آنکھیں مٹکائیں۔

"اگر مجھے نظر لگ گئی تو؟"

"وہ میں اُتار دوں گا ــــ اور میرے پاس ہی بیٹھنا گاڑی میں۔"

"کیوں تمہارے پاس کیوں؟ اپنے بھیّا کے پاس بیٹھوں گی آج تو۔ تم میرے پاس آ کر مت گھس جانا کہیں۔ ذرا ہٹ کر بیٹھنا۔"

"اچھّا اتنی نفرت؟"

"نفرت کیسی؟ مجھے لاج آئے گی۔"

"افوہ ہر بات میں لاج ہی آتی ہے تمہیں تو۔" اُس نے جلدی سے اُسکی پیشانی چومی اور دروازہ کھول کر باہر بھاگ گیا کیونکہ اندر سے کسی کے قدموں کی آہٹ قریب آ رہی تھی۔

ناشتہ کے بعد اشوک کو دولہا بنانے کی تیاری شروع ہو گئی۔ اُس کے بہنوئی جگدیپ نے اُس کو کپڑے بدلنے میں مدد دی پھر صافہ اور سہرا بھی باندھ دیا۔ خوبصورت اشوک دولہا بن کر کسی راج کمار کی طرح لگ رہا تھا۔ پہلے اُسکی موسی آگے بڑھی پیار کیا اور چٹ چٹ بلائیں لے لیں۔ پھر ماں بھیڑ کو چیرتی ہوئی آئی۔ اُس نے پیار کیا اور آنسو پونچھتی ہوئی واپس آ گئی۔ اُس کے بعد مدھو اپنی سہیلیوں کے پاس سے جھپٹ کر آگے بڑھی، سہرا ہٹا کر مُنہ دیکھا اور 'میرے بھیّا' کہتی ہوئی دونوں ہاتھ اُس کے گلے میں ڈال کر چپٹ گئی اور جب وہ اُٹھی تو آنسو اُس کی موٹی موٹی آنکھوں میں بھی جھلملا رہے تھے۔ جگدیپ نے اُسے دیکھا اور شرارت سے مسکراتے ہوئے بولا۔

"افوہ! یہ آنسوں کی رسم بھی ضروری ہے۔" اور مدھو مُسکراتے ہوئے اُس کا مُنہ چڑا کر اندر کمرہ میں بھاگ گئی۔ وہ پلٹا تو دیکھا کہ اُن کے باپ بھی اشوک کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے رومال سے آنکھیں رگڑ رہے تھے۔

"ارے بابوجی! آپ بھی۔"

"ہاں بیٹا۔ یہ خوشی کے آنسو ہیں۔ ماں باپ کی زندگی میں یہ دن مشکل سے ہی آتا ہے۔" اور پھر وہ ہٹ گئے۔

"اچھّا تو اب گھوڑی پر بٹھایا جائے۔"

"ہاں ہاں چلو"۔ گوپال بابو نے کہا۔ اور جگدیپ نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر اُٹھایا اور پکڑے پکڑے باہر کی طرف لے چلا۔ ایک طرف سے انوپ بھی اُس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ پیچھے سے عورتوں نے بنّا گانا شروع کر دیا۔

"گھوڑی چلنا بازاروں بازار"۔

شادی شہر کے شہر میں تھی اس لئے دلہن کے گھر پہونچنے میں ایک گھنٹے سے زیادہ نہیں لگا۔ وہاں آکر سب شامیانے کے نیچے بچھے فرش پر بیٹھ گئے اور عورتیں اندر چلی گئیں۔ اور تو کسی کو کوئی خاص فکر نہیں تھی لیکن پرکاش کی ماں ایک ایک چیز اور ایک ایک بات کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ اُس کو نہ تو دلہن کا گھر ہی پسند آیا نہ انتظام اور نہ اور کوئی چیز ہی۔ تھوڑی دیر بعد بولی۔

"اری شانتی! اتنی دیر ہو گئی کچھ جل پان بھی تو نہیں۔ کیسے لوگ ہیں یہ؟"

"سب ہو جائے گا جیجی! اتنی بڑی بارات ہے۔ ابھی آئے دیر ہی کتنی ہوئی ہے" اور اُس نے اتنا کہا ہی تھا کہ دودھ پستہ کی بوتلیں ٹرے میں لگ لگ کر آنی شروع ہو گئیں۔ سب سے پہلے شانتی دیوی نے ٹرے میں سے بوتل اُٹھا کر بہن کی طرف بڑھا دی اور دو بوتلیں پی کر بڈھیا خاموش ہو کر بیٹھ گئی اور اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کیا۔ کچھ دیر بعد پھر بولی۔

"یہ بملا کہاں گئی؟ اور مدھو بھی نہیں دکھائی دے رہی نہ چنچل ہی کا کہیں پتہ ہے"۔

"پتہ نہیں کہاں ہیں وہ تینوں۔ کیوں کوئی کام ہے؟"

"کام تو کچھ نہیں۔ یہیں بیٹھنا چاہئے تھا سب کو ایک جگہ"۔

"تو کیا ہو گیا بچیاں ہیں کہیں لڑکیوں کے ساتھ ہوں گی۔ بہو کی بہنیں ساتھ لئے ہوئے تھیں اُن کو۔ شائد بہو کے پاس ہوں"۔

"کتنی بہنیں ہیں بہو کی؟"

"پانچ! چھ بہنیں ہیں سب ملاکر۔"
"ائے ہئے۔ اور بھائی؟"
"بھائی ایک ہی ہے۔"
"کتنا ایک ہوگا؟" بڑھیا سوال پر سوال کئے جارہی تھی۔
"ہوگا کوئی دس بارہ برس کا۔"
"اوہو۔ پرکاش کی ماں نے بڑی حیرت اور افسوس سے کہا۔
"اور باپ کیا کرے ہے اِن کا؟"
"باپ ماسٹر ہیں اسکول میں۔"
"بس اور اتنی ساری بیٹیاں۔ چہ۔ چہ۔ چہ۔ کچھ بھی تو نہ دیکھا اشوک کے واسطے۔ اتنا قابل اور دیکھنے لائق لڑکا۔"
"دیکھتا کون؟ اُسی کو تو ضد تھی یہاں کرنے کی۔ شروع میں منع کیا تھا سب نے مگر وہ نہیں مانا۔"
"تو کیا لڑکی سندر ہے بہت۔"
"نہیں تو سانولی رنگت کی ہے۔ اچھی ہے بس۔ دیکھنے میں ایسی بُری نہیں لگتی۔"
"اور پڑھی ہوئی کتنی ہے؟"
"بارھویں کلاس تک۔" اُس کی بہن نے جواب دیا۔
"ارے جاؤ۔ تم سب باولے ہی لگو ہو مجھے تو۔ نہ صورت۔ نہ پڑھائی نہ پیسہ۔ ایسا بھی کوئی عقل کا کورا نہ دیکھا۔ اور ٹیکے میں تو کہہ رہی تھی کہ بس ۱۰۱ روپیہ ہی تھا اور اب باگ میں کتنا دیا ہے جانے؟"
"پتہ نہیں۔ تھوڑا بہت ہی ہوگا۔ خیر معلوم ہو جائے گا ابھی۔ ہم کیا کریں جی! آج کل کے لڑکے کسی کی سُنتے ہیں بھلا۔ کہتا ہے سب اچھی صورت اور روپیہ پیسہ ہی دیکھتے ہیں تو معمولی صورت اور معمولی گھروں کی لڑکیاں کہاں جائیں گی اُنکی

تو باتیں ہی نرالی ہیں۔ اب نبھانا تو اُسی کو ہے۔ ہمیں تو اچھا بھائی چھا ہے۔ بِل کر رہ لے یہی بہت ہے۔"

"واہ! یہ اچھی کہی۔" پر کاش کی ماں نے غصہ میں آ کر کہا۔ "وہ تم سے ہے یا تم اُس سے ہو۔ مانتا کیسے نہیں۔ یہ کہو کہ تم نے اُٹھایا ہی ایسا ہے اُس کو۔"

"یہ سب اِس زمانے میں نہیں چلتا جی۔ ہم کہیں کر کے بٹھا لیتے اپنی پسند کی اور وہ آنکھ اُٹھا نہ دیکھتا اُس کو یا چلا جاتا کہیں تو ہم کیا کر لیتے۔ وہ پہلا وقت تو اب رہا نہیں۔ اب تو لڑکے بالے بڑوں کو عقل بناتے ہیں۔ بس ٹھیک ہے جو کچھ ہے۔ ہمارے پاس بہترا ہے یہی بچوں کے کام آ جائے۔ دِل دُکھا کر کسی کا ہم کیا لے لیں اور بھگوان وہ روپیہ پیسہ یا سامان کہیں کو بھی نکلوا دے تو کیا ہو۔" وہ یہ باتیں کر رہی تھیں کہ پر کاش کی ماں کو مدھو سامنے کھڑی نظر آ گئی فوراً اشارے سے اُس کو پاس بلا کر بے صبری سے اُس نے پوچھا۔

"اری مدھو کچھ پتہ بھی لگا باگ میں کیا ملا۔"

"مجھے ٹھیک معلوم نہیں موسی کوئی کہہ تو رہا تھا دو ہزار دیئے ہیں شائد۔"

"بس۔ بڑے بھاری دے دیئے۔"

"سب ٹھیک ہے موسی۔" مدھو نے اُس کے کان میں جھک کر کہا۔ "زور سے نہ بولو بھیا کی ساس تمہارے پیچھے ہی کھڑی ہیں۔"

"اری ہو گا ہمیں ڈر نہیں پڑا کچھ۔"

"نہیں موسی بُری بات ہے۔" اور وہ وہاں سے ٹل گئی۔

دوپہر کو کھانے پر بھی بڑھیا ہر چیز میں مین میخ نکالتی اور بڑبڑاتی رہی لیکن کسی نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔ شام کو چائے پر بھی اُس کو کچھ پسند نہیں آیا پھر شام ڈھل گئی اور پھیروں کی تیاری شروع ہو گئی۔ دن چھپے پھیروں کے وقت وہ منڈپ کے پاس ہی آ گئی۔ یہ دیکھنے کیلئے کہ کنیا دان میں تھال کے اندر کتنے روپے پڑیں گے۔ بہو پر نظر پڑی تو اُس کا چہرہ کھلا ہوا پایا

فوراً ہی پاس کھڑی ہوئی عورت سے مخاطب ہو کر بولی۔

"کل یُگ آ گیا ہے بہن۔ دیکھو تو ایک تو صورت ہی بڑی اچھی ہے اوپر سے منہ بھی کھول رکھا ہے۔ اب یہ نیا دستور چلا ہے۔ پہلے ہاتھ بھر لمبا گھونگھٹ ہوا کرے تھا بہو کا اور ہے کیسی سوکھی سڑی۔ اشوک کے برابر میں بیٹھی اچھی بھی تو نہ لگ رہی کچھ"۔

"کچھ بھی ہے بہن پر بھاگ کی تو پوری ہے"۔ طنز سے مسکراتے ہوئے اس عورت نے کہا۔

"ہاں جی بھاگ ہی کی بات ہے۔ جب ہی تو کوندھل لونڈا مل گیا اور ماں باپ بھی اُس کے عقل کے کورے اور گانٹھ کے پورے نکلے"۔

پھیرے شروع ہو گئے تھے۔ برابر والی عورت کسی اور طرف سے دیکھنے چلی گئی تھی۔ اِس لئے بڈھیا خاموش کھڑی رہ گئی۔ تھوڑی دیر میں ایک لڑکی اُدھر سے گذری تو اُس نے اُس کا کندھا پکڑ کر روکتے ہوئے پوچھا۔

"تھالی میں کتنے روپیہ ڈالے ہیں بیٹی؟"

"ایک ہزار!" اُس نے کہا اور تیزی سے نکل گئی۔

"واہ۔ واہ! بس ایک ہزار۔ یہ بھی کوئی رقم ہے اِس زمانے میں"۔ وہ بڑبڑائی اور پھر اپنی بہن کو ڈھونڈھتی ہوئی اندر کمرہ میں چلی آئی۔ بہن تو نہیں ملی لیکن بملا اور مدھو کو اُس نے پا لیا اور وہیں کھڑے کھڑے بگڑنا شروع کر دیا۔

"اری یہ کیا تماشہ ہے۔ میں تو دیکھ دیکھ کر......"

"چپ بھی رہو ماں! بملا نے اُس کی بات کاٹ دی۔ تمہیں تو ہی پڑی ہے کیا کہیں گے سب اور اشوک سُنے گا تو اور بُرا مانے گا"۔

"ارے میں کیا ڈرتی ہوں کسی سے"۔

"اچھا ہو گا بس اب مت بولو۔ بیٹھ جاؤ۔ ایک طرف کو"۔

"ہاں موسی کیا فائدہ"۔ مدھو نے بھی اُس کو سمجھانے کی کوشش کی اور

اُس کا ہاتھ پکڑ کر صوفے پر بٹھا دیا اور دلہن کی بہن کے ساتھ ہنستی ہوئی باہر چلی گئی۔ بملا چپ چاپ برآمدے میں پڑی ایک کرسی پر جا کر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر بعد دلہن کی ماں نے اندر سے جھانک کر دیکھا اور بملا کے پھیلے ہوئے ساڑی کے پلّو سے اُس کو پہچان کر پھر آ گئی اور اُس کی طرف جھکتے ہوئے بولی۔

"اری تو نے کوئی لڑکی ڈھنگ کی دیکھی بھی یہاں ؟"

"میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔ مجھے ضرورت نہیں دیکھنے بھالنے کی۔ تم خود ہی دیکھو۔" اُس نے چڑ کر کہا۔

"تو جب سے آئی ہے لڑکیوں میں ہی ہے۔ اِس لئے کہہ رہی ہوں۔"

"تو تمہیں کس نے روکا تھا اُدھر آنے کے لئے ؟ میں یہاں لڑکی دیکھنے تھوڑا ہی آئی ہوں۔"

"اری جا جلتی لکڑی کی طرح چٹختی ہی رہے ہے ہر دم۔ تو کیا آنکھوں پر پٹّی باندھ کر بیٹھی تھی۔ بھیّا کا دھیان ہو تو کچھ کرے۔"

"تمہیں تو ہے۔ وہی بہت ہے۔ ایک بھی لڑکی ایسی نہیں ہے یہاں جو تمہیں پسند آ سکے یا تمہارے ساتھ نباہ کر سکے۔ کاٹھ کی گھڑوا لو تو بات دوسری ہے۔" اور وہ وہاں سے بھی اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"کیسی جیب چلا وے ہے۔ اِس پر تو جادو کر دیا دیکھے ہے اُس کنجنی نے۔" اور وہ بڑبڑاتی ہوئی پھر اندر چلی گئی۔

اگلے دن بدائی سے پہلے بڈھیا نے جہیز کو بہت غور سے بلکہ ایک ایک چیز کو ٹھونک بجا کر دیکھا اور بُرے بُرے مُنہ بناتی اور آپ ہی آپ منمناتی رہی اور جب نہ رہا گیا تو پھوپھی بہن کے پاس اور اکڑ کر بولی۔

"اری تو نے بہو کا دہیز بھی دیکھا ؟"

"کیا کرنا ہے دیکھ کر اپنے گھر تو جا ہی رہا ہے۔"

"بڑا بھاری جا رہا ہے کیا کہنے ہیں۔"

"اب جیسا بھی ہے۔" اُس نے آہستہ سے کہا۔

"اری جا تم دونوں بڈّھے بُڑھیا تو بچّوں کے ہاتھ کا کھلونا بن گئے پہنائی کے کپڑے تو جا کے دیکھ ذرا۔ کتنے بڑھیا ہیں۔ بھلے سے تیرے چچا نہ آئے، نہیں تو ٹھیک بنا دیتے سب کو۔ یہیں پھنکوا کر جاتے سب کچھ۔" اُس کی آواز غصّہ میں اُونچی ہو گئی تھی۔ مدھو نے دور سے اُدھر دیکھا اور تیزی سے آ کر ماں کے کان میں کچھ کہا اور دونوں ماں بیٹی اُس کو سمجھاتی ہوئی ایک طرف لے گئیں۔

تھوڑی دیر بعد ہی بدائی کا چرچہ ہونے لگا اور لڑکیوں نے دوسرے گانے چھوڑ کر بدائی کے گیت چھیڑ دیئے۔ ایک لڑکی نے جس کی آواز بہت پیاری تھی۔ شروع کیا۔

"محلوں کا راجہ بلا کہ رانی بیٹی راج کرے گی
خوشی خوشی کر دو بدا تمہاری بیٹی راج کرے گی"

اور سب نے اُس کی آواز میں آواز ملا دی۔

اس گانے کو سُن کر جو جہاں تھا وہیں بھیگی آنکھیں لئے خاموش رہ گیا بہو کا باپ جو کسی کام سے اندر آیا تھا کام بیچ میں چھوڑ کر اُسی طرف کان لگائے پاس پڑی ہوئی چارپائی پر سر جُھکا کر بیٹھ گیا اور تھوڑی دیر بعد اُسکی ہچکیوں کی آواز سنتے ہی خاندان کی بڑی بوڑھیوں نے اُس کو آ کر گھیر لیا اور تسلّی دلاسا دینے لگیں۔ اُدھر ماں رسوئی کے دروازے پر کھڑی ساڑی کے پلّو سے اپنی آنکھیں پونچھ رہی تھی۔ ایک چھوٹا سی بڑی بی اُسکے پاس بھی آئیں اور سر پر ہاتھ پھیرتے پھیرتے اُسے گلے سے لگا لیا گلے سے لگانا تھا کہ صبر اُسی کا ٹوٹ گیا اور وہ آواز کے ساتھ رونے لگی عورتیں ایسے موقعوں کی تاک میں رہتی ہیں۔ رونے رُلانے کا ماحول جہاں ہو وہاں اور ہوا دینے کے لئے بڑی خوشی کے ساتھ آگے بڑھتی ہیں ایسے وقت میں اُن کے اندر کا ایک انجانا سا

جذبہ تسکین پاتا ہے اور اُن بڑی بی کا وہاں جانا تھا کہ دو چار اور آگئیں اور آواز میں بڑا درد بھر بھر کر کہنا شروع کیا۔

"ارے ماں ہے ماں۔ پال پوس کر دوسروں کے حوالے کرنا دِل گردے کا کام ہے۔"

دوسری بولیں۔

"نہ رو بہو نہ رو۔ یہ تو دنیا کی ریت ہے۔ کیسے کیسے لاڈ سے ماں باپ چھوٹے سے بڑا کرتے ہیں اور دوسروں کے حوالے کرنا پڑ جائے ہے اب دوسرا چاہے جیسے رکھے۔"

کوئی کہتیں۔ "بس بیٹی کے بھاگ اچھے ہوں۔ نہیں تو کچھ بھی نہ ہے چپ ہو جا بیٹی! اپنے کلیجے کے ٹکڑے کو بِدا تو کرنا ہی ہو گا۔ اب تو بس بھگوان سے پرارتھنا کرو اس کے لئے" اور اِن باتوں نے اور رُلا رُلا کر آدھا کر دیا غریب کو۔ اُدھر بہنیں مُنہ اوندھائے جگہ جگہ پڑی سِسک رہی تھیں۔ گانا ختم ہو گیا تھا لیکن اُن کی سِسکیاں ابھی تک سُنائی دیتی تھیں۔ مدھو اور چنچل بہو کی ایک بہن کے پاس بیٹھی اُسکو سمجھا رہی تھیں اور چنچل تو بار بار اُس کو گُدگُدا بھی دیتی تھی لیکن آنسو اِن دونوں کی آنکھوں میں بھی آ گئے تھے اور بملا بھی ساڑی کا پلّو آنکھوں پر بار بار لے جاتی تھی۔ ہر آنکھ ہی روتی ہوئی نظر آ رہی تھی سوائے پرکاش کی ماں کی آنکھوں کے جن میں آنسو کی جگہ اسوقت بھی غصّہ جھلک رہا تھا لالچ اُس کے ہر جذبہ پر غالب آجاتا تھا۔ بملا کو روتے دیکھ کر اُسے بہت برا لگا اور پاس جاکر اُس کے کندھے پر ہاتھ مارتی ہوئی بولی۔

"تو کیوں رو رہی ہے؟ اور یہ مدھو بھی پاگل ہو گئی ہے کیا؟"

"کیا ہے ماں! بملا نے غصّہ میں بھر کر اُسے دیکھا۔ تم جینے دو گی یا نہیں؟"

"تو مر جاؤ جا کے" اور بڑھیا جلدی سے پلٹ آئی۔

لڑکیوں نے بدائی کا ایک اور درد بھرا گیت شروع کیا تو سب نے روک دیا کہ ابھی بدائی میں دیر ہے۔ اس طرح تو روتے روتے سب کا حال خراب ہو جائے گا۔ لڑکیاں تو چپ ہو گئیں لیکن تھوڑی دیر میں بینڈ باجے والوں نے اسی طرح کی دُھن چھیڑ دی۔

"بابل کی دعائیں لیتی جا۔ جا تجھے سُکھی سنسار ملے
میکے کی کبھی نہ یاد آئے۔ سسرال میں اتنا پیار ملے"

اور پھر سب رو پڑے۔ کوئی آدھے گھنٹے بعد بدائی کی گھڑی بھی آگئی سجی بجائی دلہن کو باہر لایا گیا۔ سب سے پہلے باپ نے آکر سر پہ ہاتھ رکھا اور اپنے کو بہت روک کر کہا۔

جا میری بچی بھگوان تجھے سدا سکھی رکھیں۔ میرے نام کی لاج رکھنا اور اتنا کہتے کہتے اُن کی آواز رُندھ گئی اور ضبط کے باوجود آنسوؤں کا ایک ریلا آیا اور الفاظ کو بھی بہالے گیا۔ دو تین آدمیوں نے بڑھ کر اُنہیں پکڑا اور باہر کی طرف لے گئے۔ ماں پہلے تو پاس نہیں آئی لیکن جب ایک دو عورتوں نے زیادہ کہا تو چلی آئی اور سر پر ہاتھ پھیر کر فوراً ہی پلٹ آئی۔ بہنیں سب آ آکر چپٹی رہیں اور روتی رہیں پھر سہیلیوں کی باری آئی وہ بھی ایک ایک کر کے آئیں اور اُس کے گلے میں باہیں ڈال کر روتی ہوئی واپس آگئیں۔ پھر سب کے جھُرمٹ میں وہ باہر کی طرف چلی۔ دو سہیلیوں نے اُس کو دونوں طرف سے پکڑ رکھا تھا اور پھر اُنہوں نے دروازے میں رکھی ہوئی سجی بجائی ڈولی میں لا کر اُس کو بٹھا دیا اور جیسے ہی ڈولی اُٹھنے لگی، بینڈ والوں نے دھن بجانی شروع کر دی۔

"کاہے کو بیاہی بدیس رے لکھی بابل مورے"

اور باپ وہیں کھڑا کھڑا دیوار سے سر ٹیک کر رونے لگا۔ بہنوں نے دروازے میں ہی پچھاڑیں کھانی شروع کر دیں اور ماں اندر ہی اندر کڑھ کر رہ گئی۔ پھر سب دِل کڑا کر کے اندر آ گئے۔ اندر سے باہر تک پورا گھر سُونا سُونا

ہو گیا تھا۔ لڑکی کے جاتے ہی بھرا پرا گھر نہ جانے کیوں اُجاڑ سا لگنے لگتا ہے اور جب تک وہ لوٹ کر میکے نہیں آجاتی اُداسی اسی طرح ڈیرہ جمائے رکھتی ہے رات کو نو بجے سے ہی سناٹا چھا گیا۔ تھکے ہارے نڈھال رشتے دار سب جہاں جگہ دیکھی پڑ کر غافل ہو گئے۔ اِس کے برخلاف دلہن کے آتے ہی دولہا کے گھر نہ جانے کہاں سے اتنی خوشی اور بہار آجاتی ہے کہ کچھ ٹھکانہ نہیں رہتا سب لوگ وہی ہوتے ہیں لیکن صرف ایک ہستی کے بڑھ جانے سے ایسا لگتا ہے کہ جیسے پورا گھر بھر گیا ہو۔ اسی طرح اشوک کی دلہن کے آجانے سے گھر میں رنگ ہی رنگ بکھر گیا تھا۔ گھر کا ہر فرد خوشی سے جھوم رہا تھا سوائے اُس کی موسی کے۔ پرکاش جیسا گونگا آدمی بھی بھاوج کے پاس آکر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا اور ایک آدھ فقرا بھی اُس کو چھیڑنے کے لئے اُس کے منہ سے نکلا۔ جس پر سب سے زیادہ حیرت چنچل کو ہوئی۔ مدھو کی خوشی کی تو کوئی حد ہی نہ تھی۔ پورے گھر میں اچھلتی کودتی پھر رہی تھی۔ اور یہی حال اُس کے شوہر جگدیپ اور اُس کے چھوٹے بھائی انوپ کا تھا۔ ایک مرتبہ اٹھلاتی ہوئی رسوئی سے نکل کر وہ بھاوج کی طرف جا رہی تھی کہ پیر پانی پر پھسلا اور وہ دھڑام سے نیچے آرہی۔ سب ہی دوڑ پڑے اُس کو اُٹھانے کے لئے لیکن موسی وہیں سے بیٹھے بیٹھے جل کر بولی۔

"ارے ہوش میں کہاں ہے وہ۔ ایسے اترا رہی ہے جیسے پرستان کی پری بیاہ کر لائی ہے بھیّا کے واسطے۔ اگر کچھ ہوتی بھاوج تو نہ جانے کیا حال کرتی یہ۔"

"ماں!" بملا نے بہت کلس کر پکارا۔

"چپ رہ۔ کیا ماں۔ ماں کرتی رہے ہے ہر وقت۔ بولنے ہی نہیں دیتی کسی بات میں۔ تو ہے کس کی بچی ہمیں روکنے والی۔" بڑھیا گرج ہی پڑی آخر۔

"نہیں بھئی یہ تم نے کیا کہا کس کی بچّی ہے۔ ارے تمہاری ہی ہے اور کس کی ہوتی،" اس کے بہنوئی نے اُس کے قریب آتے ہوئے کہا۔ "اور یہ جو تم ابھی کہہ رہی تھیں کہ بھاوج کسی قابل ہوتی تو نہ جانے کیا حال کرتی تو بہو تمہیں پسند

نہیں آئی کیا؟"

"ارے جاؤ بھیا۔ میں تم لوگوں سے بحث نہیں کرتی۔ تمہاری اولاد ہے چاہے گڑھے میں ڈھکیلو چاہے کنویں میں۔

"بات کیا ہے آخر؟"

"بات کیا ہوتی۔ سب کچھ جانتے ہو۔ مجھ سے کیا پوچھ رہے ہو۔"

"موسی! اتنا اونچا نہ بولو" اشوک نے پیچھے سے آکر اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دھیمے سے کہا۔ اُس کے لہجہ سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اپنا غصّہ دبا رہا ہے۔

"ارے چل چل ہم نہ اونچا بولیں نہ نیچا۔ ہمیں کیا پڑی ہے جو چاہو کرو۔"

"سُنو تو! کھانا نہیں کھاؤ گی کیا۔ اتنی دیر ہو گئی۔ ماں بلا رہی ہیں تمہیں اُدھر کھانے کے کمرہ میں۔"

"ہاں ہاں۔ مجھے ہی اُٹھا دے یہاں سے۔ تیرے باپ نہیں بیٹھے کیا یہاں۔ میں سب سمجھتی ہوں تو کس لئے مجھے ٹال رہا ہے یہاں سے۔ میری باتیں بہو نہ سُن لے کہیں۔ ارے اتنا ڈرے گا تو پچھتائے گا۔ اتنے بڑے گھر کی نہیں ہے جو تو سر پر بٹھا لے اُس کو۔ جوتی کے نیچے رکھّے گا تو ٹھیک رہے گی نہیں تو اچھل جائے گی۔"

"موسی بھگوان کے لئے چُپ ہو جاؤ۔" اُس نے غصّہ پر قابو پاتے ہوئے خوشامد سے کہا کیونکہ مصلحت اسی میں تھی اور اُس کو پکڑ کر کھانے کے کمرہ میں لے آیا جہاں اُس کی ماں۔ بملا اور پرکاش پہلے ہی موجود تھے۔ اُس کے پیچھے پیچھے اُسکے باپ بھی وہیں چلے آئے اور مدھو نے چنچل کو ساتھ لیکر کھانا لگانا شروع کیا۔ اشوک نے ایک کرسی پر موسی کو بٹھایا اور بولا۔ موسی کچھ تو سمجھ کر بات کیا کرو۔ کوئی کیا کہے گا نہیں یہاں۔ بہو دہو کی بات نہیں ہے۔ باہر میرے دوست بیٹھے ہیں اور جگدیپ بھی ہے۔ تم اتنی زور سے بگڑ

اُٹھتی ہو کہ میں بس کیا کہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے منہ سے کوئی ایسی بات نکل جائے جس سے تمہارا اپمان ہو۔ میں تمہارا بیٹا ہوں۔ تمہارا آدر کرتا ہوں لیکن میں پرکاش نہیں۔ اشوک ہوں اشوک یہ مت بھولا کرو۔" اس کا غصہ آخر چمک ہی اُٹھا اور وہ پرکاش پر ایک اُچٹتی ہوئی نظر ڈال کر باہر نکل آیا۔

"ہاں بھیّا میں تو ہوں ہی بُری۔ جس کا جو جی چاہے کہہ لو۔" بڑھیا بولی پھر اپنے بہنوئی کی طرف دیکھ کر بجھے ہوئے انداز میں بولی۔

"بس کل کو چھٹی دو ہمیں بھیّا۔"

"کیوں؟ اتنی جلدی؟" وہ حیرت سے بولے۔

"ہاں بس اب گھر بھی دیکھنا ہے جا کر۔ دوسرے پرکاش کے پتاجی ہوٹل کا کھانا کھا کر بیمار پڑ گئے تو اور پریشانی ہو جائے گی۔"

"نہیں۔ ابھی نہیں۔" فیصلہ کُن انداز میں سر کو جھٹکا دیتے ہوئے انہوں نے کہا۔

"نہیں بھیّا۔ اب تو میں رُکوں گی نہیں۔ اور کتنی بے عزتی کراؤ گے میری۔"

"اپنے بچّوں کے کچھ کہنے سُننے سے بے عزتی کہاں ہوتی ہے جیجی!"

"تم بات بھی تو ایسی کرتی ہو ماں کہ آگ لگ جائے آدمی کے بدن میں۔" اپنے موسا کی شیری پر بملا بھی بول اُٹھی۔

"ہاں ہاں تو تو سب سے آگے بولے گی۔" وہ کچھ زیادہ ہی بگڑ گئی تھی کہ اُس کے بہنوئی نے موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے قریب بیٹھی ہوئی چنچل کی کرسی کو اِس طرح جھٹکا دیا کہ وہ اپنی پلیٹ پر آگے کو جُھک کر کچھ سنبھل گئی ورنہ اُسکا مُنہ پلیٹ میں ہی جا پڑتا۔

"چاچا جی! میں اب کھانا نہیں کھاؤنگی۔" اور وہ کھڑی ہو گئی۔

"ارے نہیں بیٹھ تو سہی۔" اُنہوں نے اُس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔

"کہاں جاتی ہے۔ میں تو یہ چاہتا تھا کہ تو پلیٹ میں ہی مُنہ ڈال کر کھالے بھوک زیادہ لگی ہے نا۔ ہاتھ سے کھانے میں دیر لگتی ہے۔"

چنچل کے اِس طرح پلیٹ پر جُھکنے سے سب ہی کو ہنسی آگئی تھی اور تو سب مُسکرا ہی رہے تھے لیکن انوپ بری طرح کِھکھلا پڑا اور چنچل کِھسانی ہو کر اپنا ہاتھ چُھڑانے کی کوشش میں لگی رہی اور تھوڑی سی کشمکش کے بعد جیسے ہی اُس کا ہاتھ چھوٹا وہ بھاگ گئی باہر۔

"ارے کہاں گئی یہ۔" گوپال بابو نے بیٹھے بیٹھے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔

"اب کیا دیکھ رہے ہو۔ اُس کو چین تو لینے ہی نہیں دیتے کسی وقت بھی۔" اُنکی بیوی نے بگڑ کر کہا۔

"اری مدھو جا تو سہی دیکھ کہاں بھاگ گئی یہ۔" وہ کچھ کِھسیانے سے ہو گئے تھے۔

"جائے گی کہاں۔ رسوئی میں ہی کھالے گی بس۔ یہاں تو کچھ نہ کچھ کرتے ہی رہو گے تم۔" وہ اسی طرح بولیں۔

"چلو خیر کھالے جہاں بھی کھائے ٹھیک ہے۔" اور وہ اپنی پلیٹ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ کافی دیر کی بحث کے بعد اُنہوں نے اپنی سالی کو دو ایک دن اور رُکنے کے لئے راضی کر ہی لیا اور مطمئن ہو کر میز سے اُٹھ گئے۔

تیسرے دن ناشتہ کے بعد جب ہال کمرہ میں جمع ہوئے تو پرکاش کی ماں نے پھر اپنے جانے کی بات چھیڑی۔

"بھیا" وہ اپنے بہنوئی سے مخاطب ہو کر بولی "میں آج شام کو جانے کے لئے سوچ رہی ہوں۔ تمہارا کہنا پورا کر دیا اب تو۔"

"خیر چلی جانا شام کی گاڑی سے۔ میں کہاں روک رہا ہوں لیکن ناراض ہو کر نہ جاؤ اور ہاں میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ اس اتوار کو میرے ساتھ ہی چلیں

تو اچھا تھا۔ چھ دن اور ہیں بس۔"

"تو تم بھی چلو گے؟"

"ہاں سوچ رہا تھا بھئی۔" بات ایسی ہے" وہ گلا صاف کرتے ہوئے بولے کہ اِس غریب کے لئے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی چاہئے نا! وہ پرکاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بڑے سکون سے بولے۔

"اِس کے لئے کیا کرو گے؟ کوئی لڑکی دیکھ لی ہے کیا؟ وہ پُر امید نظروں سے اُن کا منہ دیکھنے لگی۔

"لڑکی کہاں رکھی ہے جیجی۔ تمہاری بہو بننے لائق لڑکی ڈھونڈھنا کم سے کم مجھ جیسے آدمی کے لئے تو بڑا ہی مشکل کام ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ لڑکیوں کی کوئی کمی پڑ گئی ہے دنیا میں۔ لیکن بہو، تمہاری اور بیوی پرکاش جیسے لڑکے کی، نہیں ہے آج کل کہیں نہیں ہے۔ اس لئے اِس بے زبان کی زندگی کے لئے۔" پرکاش کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُنہوں نے کہا۔ اور اپنے گھر کی روشنی کے لئے، ضروری ہے کہ ہم جا کر اُسی پہلی والی بہو کو ہی گھر لے آئیں۔

"یہ آپ نے میرے دِل کی بات کہدی موسا جی!" بملا بیچ میں ہی بول پڑی۔ ماں نے حیرت اور غصّہ کی نظر اُس پر ڈالی مگر کچھ بولی نہیں۔

"لیکن یہ کس طرح سے ہو گا۔ سوچو تو ذرا۔" پرکاش کی ماں نے اُن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔" اس کے پتا جی تو کبھی نہ مانیں گے وہ تو طلاق کے لئے کہہ رہے ہیں اور اب تک تو ہو بھی جاتی مگر ہم اِدھر آگئے۔"

"لیکن جیجی! ان کو یا تم کو طلاق کا اختیار کس نے دیا ہے۔ بیوی کو طلاق شوہر ہی تو دے سکتا ہے ہاں یہ اگر اُس کو چھوڑنا چاہتا ہے تو ٹھیک ہے۔ کیوں بھئی پرکاش؟" وہ اس کی طرف مُڑ کر بولے۔

"تم اپنی بیوی کو دِل سے چھوڑنے کے لئے تیار ہو یا ماں باپ کے ڈر

سے خاموش ہو۔"

"جی۔وہ۔وہ۔میں کیا کہوں۔"

"کہنا تو تم کو پڑے گا ہی بیٹا صاف صاف۔نہیں تو پھر چھوڑ دو۔"

"نہیں۔میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ وہ لوگ بھیجیں گے بھی اُس کو یا نہیں یہ بھی تو سوچنا ہے۔اُس کا بھائی کہہ گیا تھا کہ وہ اب ادھر نہیں آئے گی۔" وہ کچھ بھرائی ہوئی سی آواز میں بولا۔

"میری بات کا جواب دو پہلے۔اُدھر کی مت سوچو۔وہ تمہاری بیوی ہے ابھی اگر تم اُس کو بُلانا چاہو اور وہ تمہارے ساتھ رہنا چاہے تو کوئی اُسے تمہارے پاس آنے سے نہیں روک سکتا اور وہ اُسی صورت میں تمہارے پاس آنا چاہے گی جب تم اُس کا من جیت لو گے۔ یہ سب اب تمہارے اپنے ہاتھ میں ہے میں اتوار کو آؤں گا۔بھائی کو سمجھانا میرا کام ہے اور مجھے آشا ہے کہ میری بات وہ مان لیں گے۔اگر وہ مان گئے اور وہ اور بھی ہمارے ساتھ چلنے کو تیار ہوئے تو ٹھیک ہے ورنہ تم میرے ساتھ چلنا اور ہم جا کر اپنی بہو کو اپنے ساتھ لے آئینگے۔ بولو۔"

"میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی موسا جی!" کملا بیچ میں ہی بول پڑی۔

"ضرور چلنا بیٹی۔" اُس کے موسا نے اُسکی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر کہا اور پلٹ کر پرکاش کی طرف دیکھا جو کچھ بے چین سا نظر آرہا تھا اور کچھ کہنے کے لئے اپنا منہ بار بار کھول اور بند کر رہا تھا۔

"کیا ہے بیٹا! تم کچھ کہنا چاہتے ہو؟"

"جی۔میں۔یہ کہہ رہا تھا کہ میرے چاہنے نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔پتا جی کی بات ہے ساری اور ماں۔۔۔ماں۔چاہیں تو۔تو" وہ ہکلانے لگا۔

"اُفوہ بھئی ماں اور پتا جی کی بات مجھ پر چھوڑ دو۔میں کہہ تو رہا ہوں۔ تم بھی بس عجیب ہی ہو۔تم اپنی کہو اور آزادی سے کہو۔تم لانا چاہتے ہو

اُس کو؟ بولو! گھبراؤ نہیں بیٹا۔" کچھ دیر انتظار کر کے انہوں نے پھر کہا۔
"جی! میں تو چاہتا ہوں پر ــــ" اس نے اتنا کہا اور گھبرا کر ماں کی طرف دیکھنے لگا۔
"شاباش! یہ ہوئی نا بات! اچھا اب تم کہو جیجی۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم بھی کسی پھیر میں ہو۔ بات صاف ہی ہو جائے تو اچھا ہے۔"
"میں کیا کہوں بھیا۔ تم لوگ جانو۔ جب سب ہی ایک ہو رہے ہو تو مگر میں وہاں کسی طرح نہ جاؤں گی۔" اُس نے پہلو بدل کر کہا۔
"تمہیں کون کہہ رہا ہے جانے کو مگر بہو کو خوشی کے ساتھ سوئیکار تو کرو گی نا؟"
"میرا کیا ہے میں کے دن کی ہوں۔" اُس نے رکھائی سے کہا۔
"وہ آ کر ٹھیک طرح سے رہے تو میرا کیا سر پھرا ہے۔"
"سر تو نہیں پھرا ہے لیکن تم اُسے پچھلی باتیں بھول کر پیار سے رکھو گی تو وہ کیوں نہ ٹھیک رہے گی۔" اور اسی طرح کی باتوں میں دوپہر ہو گئی اور سب کھانا کھانے چلے گئے۔
شام کو بڑھیا پرکاش اور بملا کے ساتھ اپنے گھر روانہ ہو گئی گوپال بابو اُن کو اسٹیشن تک چھوڑنے آئے اور جب تک گاڑی نے سیٹی نہیں دی اُن میں یہی باتیں ہوتی رہیں اور اُن کو رخصت کر کے وہ اپنے گھر لوٹ آئے۔

"ہاں ہاں منّے۔ مارو پھونک۔ ہاں ٹھیک ہے ایسے ہی۔ اونھ یوں نہیں بھئی۔ ایسے۔ اِدھر دیکھو میری طرف۔ ممّی کی طرف بیٹے۔ اوہو۔ پھر وہی۔"

گول مٹول پیارا سا ننّا منّا تھلیش کی گود سے نیچے جُھکا ہوا، بجائے پھونک مارنے کے موم بتّی کی طرف ہاتھ بڑھا دیتا اور بہت سمجھانے پر بھی پھونک مارنے کی کوشش میں صرف شُو۔ شُو کر کے رہ جاتا۔ موم بتّی اُسی طرح جلی رہ جاتی اور تھلیش جھنجھلا جاتی بُری طرح۔

"ارے تم ہی مار دو نا پھونک___" قریب کھڑے ہوئے اُس کے شوہر روی شنکر نے ہنستے ہوئے کہا۔ ورنہ کیک کے لئے بھیّا اوِناش کی رال نکل کر یہیں بہہ جائے گی۔

"اوہو۔" حاضر جواب اوِناش نے اُن کے منہ کے بالکل نیچے ٹیبل کور ذرا سا بھیگا ہوا دیکھ کر، تیزی سے ہاتھ بڑھا کر چھوتے ہوئے جوابی حملہ کیا۔

"ارے چہ۔ چہ۔ چہ۔ بھائی صاحب کی تو بہت ٹپک گئی دیدی۔ بھئی جلدی کرو نا بہت ہو گیا۔"

اور جب روی صاحب نے ایک نظر نیچے ڈال کر جھینپتے ہوئے اِدھر اُدھر کو دیکھا تو اوِناش ایک زوردار قہقہہ کے ساتھ جیسے پیچھے کی طرف لہرایا، ایک صاحب سے ٹکرا گیا۔

"سوری بھائی صاحب آپ کہاں سے بیچ میں آ گئے"۔ کہتا ہوا وہ اُدھر ہی گھوم گیا اور پھر دونوں غور سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

"میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے"۔ اوینا ش نے کچھ یاد کرتے ہوئے کہا۔

"جی مجھے بھی کچھ ایسا ہی لگ رہا ہے"۔ وہ بولا۔

"ارے یاد آ گیا اوینا ش چونکا۔ روی بھائی کی شادی میں۔ ہاں ٹھیک ہے۔ بارات میں گئے تھے آپ چندوسی"۔

"جی۔ جی۔ ٹھیک ہی یاد آیا آپ کو۔ مجھے بھی یاد تو آ رہا تھا کچھ کچھ۔ اور صاحب آپ کی باتیں اور آپ کے وہ چبھتے ہوئے دلچسپ فقرے تو مجھے یہاں آ کر بھی کئی بار یاد آئے۔ صرف صورت آپ کی میں بھول گیا تھا تھوڑی تھوڑی"۔

اور بات یہیں تک ہی پہنچی تھی کہ پیچھے سے کسی نے جھٹکے سے ایک ہاتھ اُس کی گردن میں ڈال کر مُنہ پیچھے کو کیا اور دوسرے ہاتھ سے ایک بڑا سا کیک کا ٹکڑا زبردستی اُس کے مُنہ میں پُورا کا پُورا ٹھونس دیا۔ اُس وقت اوینا ش کی حالت دیکھنے کے قابل تھی۔ چھینا جھپٹی میں اُس کا پورا مُنہ چکنا ہو گیا تھا اور ناک اور آنکھوں تک میں کیک کے ریزے بڑی طرح بھر گئے تھے۔ کیک سے مُنہ اِس قدر بھر اور پھُول گیا تھا کہ وہ نہ تو مُنہ چلا سکتا تھا نہ بول سکتا تھا اور نہ یہاں تھوک ہی سکتا تھا۔ اُس کا مُنہ دیکھ دیکھ کر چاروں طرف سے ہنسی کے فوارے چھوٹ رہے تھے۔ خصوصاً لڑکیاں تو پچھاڑیں کھا رہی تھیں وہ بُری طرح نروس ہو گیا۔ کچھ دیر تو وہ رومال سے کھڑا اپنی آنکھیں اور ناک صاف کرتا رہا اور ہنسی کی آوازوں پر مُڑ مُڑ کر اُدھر دیکھتا رہا اور پھر باہر کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

شام کو دن چھپے کے قریب روی شنکر اوینا ش کو ساتھ لئے ہوئے باہر لان میں آ کر بیٹھے تو وہ نوجوان جو اوینا ش سے ٹکرایا تھا، پہلے ہی سے

وہاں ایک کرسی پر بیٹھا ہوا اخبار دیکھ رہا تھا۔

"آیئے صاحب!" اوِیناش کو دیکھ کر اُس نے اخبار ایک طرف رکھ دیا۔ وہ دونوں آکر بیٹھے ہی تھے کہ متھلیش بھی مُنّے کو گود میں لئے ہوئے وہیں آکر کھڑی ہو گئی۔ اوِیناش نے وہیں سے ہاتھ بڑھا کر مُنّے کو اپنی گود میں لے لیا تو وہ اُسکے پیچھے آکر دونوں ہاتھ پیار سے اُس کے کندھوں پر رکھ کر بولی۔

"اگر تو بھی نہ آتا تو مجھے نہ جانے کیسا لگتا۔"

"ارے ہاں چندوسی سے کوئی نہیں آیا دیدی؟" چھوٹے بھیّا تو دور ہیں بہت اُن کا تو سوال ہی کیا تھا آنے کا لیکن وِنود بھیّا بھابی اور بچوں میں سے تو کوئی آسکتا تھا۔" اوِیناش نے ایک کرسی اُس کے لئے اپنے پاس ہی گھسیٹتے ہوئے کہا۔

"بھابی بیمار ہیں نا! وہ لوگ کیسے آتے۔ کل شام ہی تو چٹھی آئی ہے۔ بھیّا کی۔ نہ جانے بھابی کیسی ہیں جو ایک بھی نہیں آیا۔ کھول کر نہیں لکھا اُنہوں نے۔ مجھے بڑی چنتا لگی ہے۔ آج جوابی تار بھی دیا ہے۔ بھگوان کرے ٹھیک ہی ہوں۔"

"ٹھیک ہی ہوں گی۔ کچھ بخار وُخار ہو گیا ہو گا۔ کمزور تو ہیں ہے بیچاری! آج کل موسم بھی تو ایسا ہی چل رہا ہے۔ خیر تم اتنا نہ گھبراؤ۔ تار کا جواب تو جلدی ہی آجائے گا۔"

"اور ہاں بُوا جی کیوں نہیں آئیں اوِیناش! مجھے تو بڑی آس لگی تھی اُن کے آنے کی اور وہ لڑکی کون ہے اُن کے پاس۔ لکھا تھا اُنہوں نے کہ ایک لڑکی اُن کی بیٹی بن گئی ہے۔"

"اچھا! ہوہنی دیدی کے لئے لکھا ہو گا۔ ہاں وہ اُن کی بیٹی اور ہماری بہن ہی تو ہے۔ لیکن یہ کہانی ذرا لمبی ہے دیدی۔ تمہیں فرصت ہو تو شروع کروں۔"

"ہاں ہاں تم سناؤ۔" وہ اشتیاق سے سنبھل کر بیٹھ گئی۔

وہ آدمی اُٹھ کر جانے لگا تو روی شنکر نے اُس کو رُکنے کے لئے کہا اور بیوی سے بولے۔

"بھئی یہ انل تو جانے لگے۔ تمہاری وہ کہانی نہ جانے کتنی دیر چلے"۔ اور پھر انل کی طرف دیکھتے ہوئے اوینا ش سے بولے۔

"ارے پہلے کم سے کم تم لوگوں کو انٹروڈیوس تو کرا دوں۔ بھئی انل اِس سالے کو تو تم جانتے ہی ہو"۔

"دیکھئے دیکھئے بھائی صاحب شرافت کا اتنا فائدہ نہیں اُٹھایا جاتا"۔ اوینا ش نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"ارے بھئی رِشتہ تو میں صحیح ہی بتا رہا ہوں۔ اب جب تم ہو ہی تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ اور یہ انل ہمارے کزن ہیں۔ ان کی ماں بُوا ہوتی ہیں ہماری کسی رشتے کی اور یہ کہ قریب ہی ان کا مکان ہے اور یہ یہاں کے ایک کالج میں بچّوں کو تاریخ پڑھاتے ہیں اور ۔۔۔"

"بس اب ہو گیا انٹروڈکشن ختم بھی کیجئے"۔ متھلیش چڑ سی گئی اور انل سے مخاطب ہو کر بولی۔

"بیٹھو انل۔ اتنی بھی جلدی کیا ہے بھیّا۔ بس اب کھانا کھا کر ہی جانا"۔

"اچھّا بھابی۔ آپ کہتی ہیں تو بیٹھ جاتا ہوں۔ یہ لیجئے"۔ اور وہ بیٹھ گیا۔

"ہاں اوینا ش اب سُناؤ۔ مگر ذرا ٹھہرو۔ کچھ یاد کرتے ہوئے اُس نے کہا میں مُنّے کو دودھ بنا کر پلا دوں ذرا" اور مُنّے کو اُٹھا کر وہ اندر کی طرف چلی گئی۔ اُس کے جانے کے بعد اوینا ش۔ روی اور انل کچھ دیر تو خاموش بیٹھے رہے پھر روی شنکر نے خاموشی کو توڑتے ہوئے انل کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ہاں بھئی انل تمہارے معاملہ کا کیا رہا؟ کیا کہتے ہیں پتا جی اب؟ کوئی تاریخ سوچی جا رہی ہے یا نہیں شادی کے لئے؟ اب تو ہو ہی جائے تو اچھّا ہے۔ تم چُپ چُپ سے پھرتے ہو ذرا رونق تو آئے تمہارے چہرے پر"۔

"رونق دونق اب کیا آئے گی بھیّا اور چُپ چُپ بھی میں اور ہی وجہ سے ہوں۔" انل نے بجھے ہوئے انداز میں کہا۔

"کیوں! کیا ہوا آخر؟"

"ہونا کیا! پتاجی کسی طرح بھی نہیں مان رہے ہیں۔ ماں تو کچھ نرم پڑی بھی تھیں مگر پتاجی کے غصّہ کے آگے تو کسی کی بھی نہیں چل پا رہی۔ کہتے ہیں میری مانو تو رہو ورنہ گھر چھوڑ دو اور میں آپ کو کس طرح بتاؤں بھیّا انھوں نے تو سہارنپور انکار کی چھٹّی بھی لکھ دی ہے۔"

"ارے چہ۔ چہ۔ چہ یہ تو بڑے افسوس کی بات سُنائی تم نے۔ بہت بُرا کیا انھوں نے۔ کیا گذری ہوگی اُن لوگوں پر اس چھٹّی سے۔ خاص طور پر بوڑھے منشی دینا ناتھ تو اِس صدمے میں جان سے نہ چلے جائیں کہیں۔ اگر اُن کا جوان بیٹا بھگوان نے لے لیا تو اِس میں ان کا کیا قصور ہے۔ ہائے کیا ہو گیا ہے اِن لوگوں کو۔"

اوِیناش جو ہکّا بکّا یہ سب سُن رہا تھا۔ منشی دینا ناتھ کے نام اور جوان بیٹے کی بات پر بُری طرح چونکا اور تیز گھبرائے ہوئے لہجہ میں بولا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں بھائی صاحب؟ منشی دینا ناتھ؟ جوان بیٹا؟ یہ سب کیا ہے؟ کیا۔ کیا یہ لکشمی کی بات تو نہیں؟ اُس کی منگنی ہو گئی تھی۔ کیا وہ ٹوٹ گئی؟ ہائے یہ میں کیا سُن رہا ہوں۔" ماتھے پر ہاتھ مار کر پہلے وہ اُٹھ کر کھڑا ہوا پھر اپنا سر دونوں ہاتھوں میں لے کر وہیں بیٹھ گیا اور کوئی دو منٹ بعد سر اُٹھا کر بولا۔

"یہ مسٹر انل میری معصوم بہن لکشمی کے منگیتر ہیں؟ اُن لوگوں کی بربادی میں بھی ایک کسر رہ گئی تھی سو آج پوری ہو گئی۔ تو میں چلوں پھر مجھے جلدی ہی اُن کے پاس پہونچنا چاہیئے۔ لکشمی نادان تو نہ جانے کیا کر گذرے گی اور بابوجی! وہ تو اس خبر کو سُن کر زندہ بھی نہ رہ سکے ہوں گے شائد اور موہنی؟ میری بہن

وہ تو خود ہی زندگی اور موت کے بیچ لٹکی ہوئی ہے۔ وہ اب سنبھل رہی تھی دھیرے دھیرے پر اب گر جائے گی اور کون جانے پھر اٹھ بھی سکے یا نہیں" یہ سب کہتے کہتے وہ رو پڑا اور پھر اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"میں جاتا ہوں بھائی صاحب۔ میرا جانا اس وقت ان لوگوں کے لئے بہت ضروری ہے۔ میں اُن سب کو سنبھالنے کی کوشش کروں گا۔ میں بابوجی کو اور اپنی بہنوں کو موت کے مُنہ میں نہیں جانے دوں" اُس کی آواز تیز ہو گئی تھی۔

"ارے بیٹھو تو اوینا ش! سنو تو ـ" روی شنکر نے کھڑے ہو کر اُس کو پکڑتے ہوئے کہا دوسری طرف سے انل بھی حیرت زدہ سا اُس کو پکڑ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

"پوری بات تو بتاؤ اوینا ش! شاید حالات سُدھر جائیں۔ پتا جی ان کے کیسے بھی ہی لیکن انل ایسا نہیں ہے" روی شنکر نے کہا۔

"ہاں ہاں آپ ذرا دھیرج رکھیں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اور اس وقت اتنی جلدی آپ کو گاڑی بھی کونسی ملے گی۔ بھیّا کار پہلے خراب پڑی ہے" انل نے بڑی نرمی سے کہا اور اُس کو زبردستی کرسی پر بٹھا دیا۔

"ہاں تو معاملہ کیا ہے۔ شروع سے بتاؤ" روی بے چینی سے بولے۔

"بات وات کیا ہے بھائی صاحب۔ وہ لڑکی جو آج کل ہمارے پاس ہے اور جس کے لئے میں ابھی دیدی کو بتانے جا رہا تھا وہی بد نصیب موہنی تو ہے۔ منشی صاحب کی بڑی لڑکی۔ بے وقوف۔ بے حس اور بے درد شوہر کی بیوی اور ظالم ساس سسر کی بہو۔ جنہوں نے اُس کے اوپر ذرا رحم نہیں کھایا اور صرف اِس وجہ سے موت کے دروازے پر لا کر کھڑا کر دیا کہ اُن کی مرضی کے مطابق جہیز اور روپیہ پیسہ لے کر نہیں آئی تھی اور پھر بڑی کسمپرسی کے عالم میں سماج کی گندی کیچڑ میں لتھڑا ہوا وہ نازک سا پھول۔ وہ انمول رتن مراد آباد اسٹیشن پر میرے ہاتھ لگ گیا۔ اُس کا بیمار اور غم میں سلگتا ہوا

بے قصور بھائی ستیش بھی اُس کے ساتھ تھا۔ مجھے وہ بالکل کملیش دیدی جیسی لگی۔ اگر آپ بھی اُس کو دیکھیں تو یقین نہیں کریں گے کہ وہ کملیش نہیں ہے۔ غور سے دیکھنے پر تھوڑا فرق نظر آئے گا۔ اور پھر وہ مجھے کملیش سے بھی زیادہ پیاری ہو گئی۔ میں اُس کے لئے جان بھی دے سکتا ہوں۔ میں اُس کو۔ میں اُس کو ....." وہ پھر تڑپ اُٹھا تھا اور پھر دھیمی آواز میں اُس نے کہا۔

"اب تو ماں جی بھی اُس کے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ وہ اُس کے سامنے اپنی بیٹی کو بھول گئی ہیں اور اُس کی صورت دیکھ دیکھ کر جیتی ہیں۔" یہ کہتے ہوئے اُس نے تھوڑا سا مڑ کر اپنے بائیں طرف نظر اُٹھائی جہاں متھلیش آنکھوں میں آنسو لئے موجود تھی کیونکہ اُس نے بھی سب کچھ سُن لیا تھا۔ اُس کو دیکھتے اویناش کرسی سے اُٹھا اور اُس کے کندھے پر سر رکھ کر ہچکیاں لینے لگا روی بھی پریشان ہو گئے تھے اور انل بھی بہت متاثر نظر آتا تھا۔ روی نے اُٹھ کر ان دونوں بہن بھائیوں کو الگ کیا اور کرسی پر بٹھا کر اویناش کی دِل جوئی کے لئے الفاظ تلاش کرنے لگے۔ کچھ دیر کے بعد منّے کے رونے کی آواز سُن کر متھلیش اُٹھی تو سب ہی اُٹھ کر اندر جانے کے لئے کھڑے ہو گئے۔ انل کافی جذباتی ہو رہا تھا چلتے چلتے اویناش کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُس نے کہا۔

"آپ نراش نہ ہوں بھائی صاحب۔ پتا جی اگر مانتے ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ میں۔ میں..... مجھے بھگوان نے اس قابل کر دیا ہے کہ اکیلا اپنے گھر کا بوجھ اٹھا سکوں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔" اویناش کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "لیکن لڑکی کے لئے یہ ٹھیک نہیں رہتا۔ کسی طرح بھی نہیں۔ اُس کی زندگی خراب ہو جائیگی۔"

"وہ کس طرح ؟" انل نے کہا۔

"وہ اِس طرح کہ اپنا گھر چھوڑنے کے بعد اگر آپ کو کوئی ایسا ویسا خیال آ گیا کبھی کہ ... میرا مطلب ہے کہ کسی وقت آپ پچھتانے لگے کہ اُس کی وجہ

سے آپ کو اپنا گھر۔ گھر کی خوشیاں عیش آرام اور سب سے بڑھکر اپنوں کو چھوڑنا پڑ گیا تو کیا ہوگا۔ ادھر آپ کے ماں باپ بھی اُس کو ہمیشہ بُرائی دیتے رہیں گے کہ اُس نے اُن کا بیٹا اُن سے علیحدہ کر دیا۔ ان تلخیوں کا اثر اُس غریب کی زندگی پر پڑ سکتا ہے اور یہ میں برداشت نہ کر سکوں گا۔ اِس لئے بہتر یہی ہے کہ آپ اُس کو بھول جائیں۔ میں کوئی لڑکا دیکھوں گا اور اچھا گھر بھی جہاں وہ خوش رہ سکے۔ میرے ہوتے ہوئے اُس کے لئے اب کوئی پریشانی نہیں ہے۔" اور کچھ دیر خاموش رہ کر وہ پھر بولا۔

"اور لینے دینے کی بھی ہمیں کوئی پروا نہیں بھگوان کا شکر ہے ہزاروں سے اچھے ہیں۔ میں بھی اب کچھ کرنے کے قابل ہو ہی جاؤں گا اور ہمارے بڑے والے ونود بھیّا تو کسی سے کم ہیں ہی نہیں۔ وہ تو اتنے مہان ہیں کہ میرے بغیر کہے ہی روپیہ پیسے اور سامان سے لاد دیں گے اُس کو۔ دیکھیں گے کتنا مانگے گا کوئی۔" جوش میں سوچے سمجھے بغیر وہ نہ جانے کیا کیا کہہ گیا۔

"میں بہت شرمندہ ہوں بھائی صاحب۔" انل لجاحت سے بولا۔

"آپ ایک مرے ہوئے آدمی کو اور مار رہے ہیں۔ آپ میرا یقین تو کریں ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ رہی گھر والوں کی بات تو وہ بھی رفتہ رفتہ راہ پر آ ہی جائیں گے۔ اب تو مجھے اکیلے ہی یہ کام کرنا پڑے گا۔ جب ماں باپ ایک ایسی بات کے لئے مجھے مجبور کر رہے ہیں جو سراسر غلط ہے تو بتائیے پھر کیا کروں ایسا نہ کروں تو۔ میں آپ کا وشواس گھات نہیں کروں گا بھائی صاحب۔ وعدہ کرتا ہوں۔ آپ مجھے آزما کر تو دیکھئے۔" آخیر میں اُس نے اویناش کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر التجا آمیز لہجہ میں کہا۔

"اب آپ جائیں لیکن اِس فیصلہ سے پہلے اچھی طرح سوچ لیجئے۔" اویناش نے اُسی سرد مہری سے کہا۔

"اس میں سوچنا سمجھنا کیا ہے۔ میں کہہ تو چکا ہوں آپ سے سب کچھ۔

کہئے تو میں آج ہی چلوں آپ کے ساتھ؟"

"نہیں نہیں اتنی جلدی نہیں۔" اویناش بولا۔ "شادی تو میں پوری تیاری سے کروں گا تاکہ آپ کے پتاجی بھی دیکھیں کہ ....."

"ارے صاحب۔" انل نے اُس کی بات کاٹ دی۔ وہ سب آپ بعد میں کرتے رہئے گا چاہیں تو۔ ویسے تو مجھے کسی چیز کا لالچ نہیں ہے۔ بس شادی ہو جائے اب تو۔"

"انل ٹھیک ہی کہہ رہا ہے اویناش جو تم چاہتے ہو وہ بعد کو بھی ہوتا رہے گا۔"

"نہیں بھائی صاحب۔ غیرت گوارا نہیں کرتی کہ ...."

"اچھا ایک کام کرو۔ تم کل اِس کو اپنے ساتھ سہارنپور لے جاؤ۔ اُن لوگوں کو کم سے کم اطمنان تو ہو ہی جائے گا۔ شادی جب موقع ہو گا ہو ہی جائیگی یہ یہاں آکر اپنے پتاجی کو سب بتا دیں گے اور میرا خیال ہے کہ اُن کو اب اِس پوزیشن میں اعتراض بھی کیا ہو سکتا ہے اُن کے ارمان تو نِکل ہی جائیں گے اور اگر پھر بھی وہ کچھ گڑبڑ کریں گے تو بس وہی پہلی والی بات چلے گی۔"

"ٹھیک ہے تو چلیئے۔" اویناش نے کہا اور پھر اِدھر اُدھر کی باتیں شروع ہو گئیں۔ روی صاحب نے اچانک ہی کچھ یاد کر کے کہا۔

"ہاں بھئی اویناش! تم علی گڈھ میں وہ M.B.A کا کورس جو کر رہے تھے وہ پورا تو ہو گیا ہے نا؟"

"جی ہاں وہ تو پورا ہو گیا تھا۔ بس اب سوچا جائے گا کچھ کرنے کے لئے"

"آہا تو میرا بھیّا بھی کماؤ ہو جائے گا اب۔" متھلیش نے اُس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں پھر بولی۔

"اب تو سہارنپور جاؤ گے تم۔ وہاں سے پھر یہیں آجانا۔ میں بھی تمہارے ساتھ رُڑکی چلوں گی۔" لیکن سریندر کیا کہے گا۔ اُس سے الگ ہوتے ہوئے

اُس نے کہا اور ہنس پڑی۔

"وہ کیا کہیں گے" اویناش نے حیرت سے کہا۔

"وہ کہے گا کہ پوری سسرال نے ہی میرے اوپر دھاوا بول رکھا ہے۔"

"ارے نہیں دیدی! تم کیا جانو اُن کو"

"میں سب جانتی ہوں" سنجیدہ ہوتے ہوئے اُس نے کہا۔

"نہیں اتنا نہیں جانتیں تم۔ وہ تو دیوتا ہے دیدی۔ نہ جانے کیسے زمین پر اُتر آیا۔ اب یہی دیکھ لو۔ موہنی دیدی کا جی جان سے علاج کر رہے ہیں وہ ایک سوکھے ہوئے پتلے سے تنے کو اتنی محبت سے سینچ رہے ہیں کہ اب اُس میں کونپلیں پھوٹتی نظر آنے لگی ہیں۔ بہت فرق ہو گیا ہے پہلے سے اُس کی حالت میں ساتھ ہی ساتھ جینا بھی سکھا رہے ہیں اُس کو اور پھر بڑی بات یہ کہ ایسا لگتا ہے کہ وہ اُس کو اپنانا بھی چاہتے ہیں۔"

"سچ!" متھلیش نے خوش ہو کر کہا۔ "یہ تو بہت بڑی بات ہے اویناش۔"

"اور کیا! اور پھر یہ ظاہر بھی تو نہیں ہونے دیتے کہ وہ اتنا بڑا احسان کر رہے ہیں۔"

"سریندر بہت اونچا انسان ہے۔ میں تو اُس کو دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا۔" ردی بھی بولا۔

"ہاں سچ ایسا آدمی تو آج کی دنیا میں ڈھونڈھے سے بھی نہ ملے گا۔" متھلیش نے بھی اعتراف کیا۔ "بُواجی کی اتنی عزّت کرتے ہیں اور اتنا خیال رکھتے ہیں کہ شائد بیٹا بھی نہ رکھ سکے۔ ایک بار چندوسی میں ایسا ہوا کہ بُواجی کی چپل بنکی نے کھیلتے کھیلتے دوسرے کمرہ میں جا کر ڈال دی۔ گھٹنیوں تو چلتی ہی تھی وہ بُواجی جس سے بھی کہیں وہ اِدھر اُدھر نظر ڈال کر آگے بڑھ جاتے اور اپنے کام میں لگ جاتے۔ بُواجی ایک بار کہہ کر پھر باتوں میں

لگ جاتی تھیں۔ سریندر کہیں سے آکر بیٹھے ہی تھے جیسے ہی سُنا ڈھونڈھنے کے لئے کھڑے ہو گئے اور تھوڑی دیر میں دوسرے کمرہ سے چپل ہاتھ میں لئے ہوئے آئے اور جُھک کر اپنے ہاتھ سے اُن کے پیروں میں پہنانے لگے۔ وہ نہیں۔ نہیں کرتی رہیں مگر پہنا کر ہی چھوڑی۔ بولے ــ آپ کیسی باتیں کرتی ہیں ماں جی۔ یہ تو ہمارے لئے بڑے نصیب کی بات ہے کہ ہم آپ کی کوئی چھوٹی موٹی سیوا کر سکیں۔ سب ہی دیکھ کر دنگ رہ گئے اور بُوا جی تو رو پڑیں اُن کی اس بڑائی پر۔" اور پھر وہ ایک ٹھنڈا سانس کھینچتی ہوئی بولیں۔

"لیکن کملیش کے مرنے کے بعد تو بالکل ہی بجھ کر رہ گیا بے چارہ۔ بھگوان آگے کو سُکھی رکھیں اُس کو ــ اور ہاں پنکو کیسی ہے؟ اب تو خوب باتیں بناتی ہوگی کتنے دن بیت گئے دیکھے ہوئے۔"

"ارے ایسی ویسی باتیں کرتی ہے وہ دیدی۔ تم اب دیکھو اُس کو تو خوش ہو جاؤ مینا کی طرح چہچہاتی ہی رہتی ہے ہر دم۔ موہنی دیدی سے تو اتنا پیار ہے اُس کو کہ ذرا دیر نہ دیکھے تو منہ اُتر جاتا ہے۔ ماں ہی سمجھتی ہے ان کو اور وہ بھی اتنا ہی چاہتی ہے اُس کو۔"

"اچھا؟" بچّی کو ماں مل جائے گی چلو۔ اگر ایسا ہو جائے تو بہت ہی اچھا ہو گا۔"

"لیکن وہ خود مان جائے جب نا!"

"کیوں وہ کیوں نہ مانے گی بھلا؟"

"تم اُس کی عادت کو نہیں سمجھ سکتیں دیدی۔ وہ تو بس عجیب ہی ہے کچھ۔ اپنے کو ہر ایک سے اتنا کم سمجھتی ہے کہ بس پوچھو نہیں۔ نراشش الگ ہے اپنی طرف سے۔"

"خیر ٹھیک ہو جائے گی سب کے سمجھانے بُجھانے سے ماننا ہی پڑے گا اُس کو۔" متھلیش نے کہا اور پھر سب کھانا کھانے چلے گئے۔ انل نے بہت

ہی کم کھایا۔ بس بیٹھا سب کا ساتھ دیتا رہا اور اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔
"بیٹھو بھئی" ایک ساتھ ردی صاحب اور اویناش نے کہا لیکن وہ بہت تھکا تھکا سا لگ رہا تھا بولا۔
"بس اب جانے ہی دیجئے۔ لیٹوں گا جا کر ذرا" اور چلتے چلتے رُک کر بولا۔
"ہاں تو کل کس گاڑی سے چلنا ہے اویناش بھائی"
"دوپہر والی سے" متھلیش پانی پیتے ہوئے بولی۔
"اچھا تو نمسکار آپ سب کو" اُس نے جُھک کر ہاتھ جوڑے اور باہر نکل گیا۔
وہ سب اپنے اپنے بستروں پر چلے گئے لیکن اویناش کی نیند تو نہ جانے کہاں چلی گئی تھی۔ لاکھ کوشش کرنے پر بھی پوری رات وہ سو نہیں سکا، اور صبح پانچ بجے بستر چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اُدھر لائٹ کے جلنے اور چلنے پھرنے کی آہٹ پا کر متھلیش بھی جاگ گئی جو برابر کے کمرہ میں لیٹی ہوئی تھی اور پھر باہر برآمدے میں نکل آئی۔
"کیا ہے اویناش اتنی جلدی کیوں جاگ گیا بھیا؟"
"مجھے نیند ہی نہیں آئی رات دیدی، اُس نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔۔۔
"اور اب میں نے سوچا ہے کہ میں پہلے رُڑکی ہی جاؤں گا۔ سہارنپور نہیں جاؤں گا"
"لیکن کیوں؟"
"میرا جی کئی بار تو بہت گھبرایا رات۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے دیدی کہ موہنی دیدی کے ساتھ کچھ گڑبڑ والی بات ہو گئی ہے۔ اُسے معلوم تو نہیں ہو گیا کچھ؟ ویسے ہونا تو نہیں چاہئے ایسا اس لئے لکشمی یا بابوجی اُسے لکھ تو نہیں سکتے ایسی بات۔ پھر بھی میں پہلے وہیں پہونچوں۔ یہی ٹھیک رہے گا"
"ہاں ہے تو ٹھیک ہی متھلیش بولی۔ لیکن اُن کے پتا بھی تو بوڑھے آدمی

ہیں تم پہلے وہیں جاؤ تو زیادہ اچھا رہے گا۔"

"ان سے پہلے موہنی کے من کی شانتی ضروری ہے دیدی تمہیں کیا پتہ وہ کتنی کومل اور چھوٹی سی بات پر چھوئی موئی کی طرح کمہلا جانے والی لڑکی ہے اور یہ بات تو بہت بڑی ہے اس کے لئے بلکہ میں تو یہ کوشش کروں گا کہ وہ ابھی وہیں رہے ماں کے پاس تو ٹھیک ہے۔ جب انل وہاں پہونچ جائیگا اور سب معاملہ ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔ جب ہی میں اس کو لے کر آؤں گا اس کے گھر۔ تم انل سے کہہ دینا کہ وہ سیدھا سہارنپور پہونچ جائے اتنے میں بھی موہنی دیدی کو دیکھ کر وہاں آجاؤں۔"

"اب تم جانو۔" وہ کھوئی کھوئی سی بولی۔ میری رائے تو یہ تھی کہ انل کو ساتھ لے کر پہلے تم وہیں جاتے۔"

"نہیں دیدی! میرا دل کہتا ہے کہ موہنی دیدی بہت پریشان ہے۔ رات تھوڑی دیر کو میری آنکھ لگی تھی تو میں نے دیکھا کہ دونوں ہاتھ پھیلائے وہ مجھے پکار رہی ہے۔ مجھے جانے ہی دو اب۔"

"اچھا چلے جانا لیکن ابھی تو بہت دیر ہے ابھی سے کیوں آکر بیٹھ گئے یہاں؟"

"تم جا کر لیٹ جاؤ دیدی۔ میں بس یہیں ٹھیک ہوں۔ نیند تو ویسے بھی نہیں آئے گی۔"

"نہیں بھیا۔ اب نیند تو مجھے بھی نہیں آئے گی میں بھی یہیں بیٹھتی ہوں تیرے پاس۔" اور وہ دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔

"اویناش بھیا آ گئے صاحب" شامو نے سبزی کا ڈونگہ ڈاکٹر کے پاس
میز پر رکھتے ہوئے کہا۔
"کہاں ہیں؟"
"وہ اُدھر ماں جی کے کمرہ کی طرف گئے ہیں"
"اِدھر بُلا لو۔"
"جی اچھا!" اور وہ باہر چلا گیا۔
دو منٹ بعد اویناش کھانے کے کمرہ میں داخل ہوا۔
"آؤ اویناش۔ بڑی جلد ہی آ گئے۔ آؤ کھانا کھا لو"
"جلدی کیا آ گیا۔ جس بات سے ڈر تھا وہی سامنے آ گئی"
"کیا مطلب؟" ڈاکٹر نے حیرت سے کہا۔
"مطلب یہ کہ بجائے سہارنپور جانے کے یہاں اِس لئے آیا تھا کہ
موہنی دیدی کے پاس کوئی چٹھی نہ آ گئی ہو گھر سے"
"تو تم سہارنپور ہوتے ہوئے نہیں آئے؟"
"نہیں۔ میں تو انبالہ سے سیدھا آ رہا ہوں"
"تو تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ اُن کی بہن کی منگنی ٹوٹ گئی ہے"
"ارے آپ بھی جانتے ہیں۔ تو کیا۔ تو کیا ماں اور دیدی یہ خبر سُن کر

ہی وہاں گئی ہیں۔ میں سمجھا دیدی یونہی ضد کر کے چلی گئی ہوں گی۔"
"نہیں بھئی اُن کو معلوم ہو گیا تھا یہیں اور یہ غلطی بھی مجھ سے ہی ہو گئی تھی جس کے لئے پچھتا رہا ہوں برابر۔"
"ہوا کیا آخر؟ خبر کس طرح آئی یہاں؟"
"ارے میاں وہ میرا دوست ڈاکٹر رضوی جو پہلے بھی ایک بار یہاں آیا تھا اور تم کو بلا تھا وہی آ گیا تھا۔"
"پھر؟"
"پھر کیا میں ڈرائنگ روم میں بیٹھا اُس سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ اِن لوگوں کو اچھی طرح جانتا ہے اور ان کے مکان کے قریب ہی اُسکی ڈسپنسری ہے سہارنپور میں اور وہ اُن کا فیملی ڈاکٹر ہے ایک طرح سے اور اُن کا ہمدرد بھی۔ اُسی نے یہ خبر مجھے سنائی اور جس وقت ہم لوگ باتیں کر رہے تھے وہ نہ جانے کیسے تمہارے کمرہ میں آ گئیں اور سب کچھ سُن لیا۔"
"پھر کیا ہوا۔ دیدی نے.... کچھ۔ میرا مطلب ہے کہ وہ زیادہ یعنی۔"
"بے ہوش ہو کر گر گئی تھیں۔" ڈاکٹر نے اُس کی بات بیچ میں ہی کاٹ کر پشیمانی سے کہا۔ "میں نے اور سعید رضوی نے بڑی مشکل سے سنبھالا بہت سمجھایا بجھایا تو ٹھیک ہوئیں کچھ پر اب نہیں کہہ سکتا کہ وہاں جا کر کیا حال رہا۔ رضوی کے ساتھ ہی گئے تھے ویسے یہ لوگ۔ راستے میں تو اُس نے خیال رکھا ہو گا اسی لئے مجھے بھی تھوڑا اطمنان رہا۔"
"تو پھر مجھے اب وہاں پہونچنا چاہئے جلد ہی۔ تاکہ اُن سب کو ہی کچھ تو اطمنان ہو جائے۔ میں شام کو ہی نکل جاؤں گا بس تو۔" اوینا شں نے اُسی بے چینی سے کہا۔
"اطمنان کیسا؟" ڈاکٹر نے چونک کر پوچھا۔
"وہ لکشمی کی منگنی جس لڑکے سے ہوئی تھی نا وہ متھلیش دیدی کے

قریب ہی رہتا ہے وہاں بچے کی سالگرہ میں اُس سے ملاقات ہو گئی تھی۔" اور پھر اوِیناش نے ڈاکٹر کو پوری بات سُنا دی۔

"چلو اچھا ہوا بہت ہی اچھا ہوا۔" ڈاکٹر نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"پھر تو تم کو فوراً ہی وہاں پہونچنا چاہئے واقعی ــــ اچھا کھانا تو کھالو۔ ٹھنڈا ہو جائے گا بالکل ہی۔"

"آتا ہوں ابھی ذرا منہ پر چھینٹا مار لوں۔" وہ باتھ روم کی طرف بڑھ گیا اور کھانا کھا کر ڈاکٹر تو کہیں چلا گیا اور اوِیناش تھوڑا آرام کرنے کے لئے بستر میں جا کر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ کوئی پانچ منٹ گذرے ہوں گے کہ لیٹے لیٹے اُسے سردی سی محسوس ہوئی اور بدن بھی ٹوٹتا ہوا معلوم ہوا۔ اُس نے پائنتی سے رضائی کھینچی اور سر سے پیر تک لپیٹ کر غافل ہو گیا۔

ٹھیک چار بجے ڈاکٹر آیا اور شامو سے جلدی چائے بنانے کے لئے کہہ کر کھانے کے کمرہ میں آ کر بیٹھ گیا پھر کچھ سوچتے ہوئے اُٹھا اور اوِیناش کو آواز دیتا ہوا اُس کے کمرہ میں آ گیا۔

"ارے ابھی تک سو رہے ہو؟ جانا نہیں ہے کیا؟" اُس نے رضائی اُس کے مُنہ پر سے ہٹاتے ہوئے کہا۔ لیکن وہ اسی طرح لیٹا رہا۔ ڈاکٹر نے اُسکے پاس بیٹھ کر دو ایک آوازیں اور دیں اور جب دیکھا کہ وہ اب بھی بے حس و حرکت پڑا ہوا ہے تو جُھک کر اُس کے ماتھے کو چھُوا اور گھبرا کر فوراً ہی کھڑا ہو گیا۔

ارے اِس کو تو بخار معلوم ہوتا ہے۔ اُسنے آہستہ سے کہا اور رضائی میں سے ہاتھ نکال کر اُس کی نبض پر ہاتھ رکھتے ہوئے شامو کو آواز دیکر دواؤں کا بکس منگوایا۔ اور جب وہ لے آیا تو تھرمامیٹر نکال کر اُس کو آواز دی۔

اوِیناش نے اُس کی آواز پر آنکھیں کھول کر دیکھا اور بولا۔

"کیا ہے؟"

"تم کو بخار ہو گیا ہے بھیّا۔ لو یہ تھرمامیٹر لگاؤ ذرا۔"
"ارے بخار ہو گیا؟" اویناش نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا اور اُٹھکر بیٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔
"لیٹے رہو۔ گھبراؤ نہیں۔ ٹھیک ہو جاؤ گے۔ مجھے ذرا دیکھنے دو۔" ڈاکٹر نے شفقت بھرے انداز میں کہا۔
"لیکن۔ لیکن۔ مجھے تو جانا تھا ابھی۔" اُس نے افسوس سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔
"چلے جانا۔ بخار جلدی ہی اُتر جائے گا ۔ پریشان مت ہو۔ ملیریا معلوم ہوتا ہے۔" اُس کو اچھی طرح دیکھنے کے بعد وہ بولا۔
"ہاں مجھے سردی لگی تھی شروع میں۔ رضائی میں بھی لگتی رہی اور پھر پتہ نہیں چلا کہ کہاں ہوں۔"
"ہاں یہی بات ہے خیر۔ لو یہ کلوروکوئن کھاؤ۔" اور پانی سے وہ گولی کھلانے کے بعد ڈاکٹر نے اُس کو پھر رضائی اُڑھا کر لِٹا دیا اور شامو سے چائے وہیں لے آنے کے لئے کہکر وہیں کرسی پر بیٹھ گیا اور جب چائے آگئی تو پہلے ایک پیالی بنا کر خود پی اور تھوڑی دیر میں ایک پیالی بنا کر اویناش کو پلوائی اور اُس کو آرام سے لیٹے رہنے کی تاکید کرتا ہوا باہر چلا گیا۔
اگلے دن صبح کو بخار اُس کا بہت کم نِکلا اور طبیعت بھی ہلکی تھی۔ اِس لئے پھر اُس نے اپنے جانے کی بات چھیڑی۔ پہلے تو ڈاکٹر نے تعجّب سے اُس کی طرف دیکھا پھر بولا۔
"چلے جانا۔ بخار تو اُتر جانے دو۔"
"لیکن بھائی صاحب آپ یہ تو سوچیئے۔"
"سوچنا دوچنا کچھ نہیں۔" اُس نے اُس کی بات کاٹ کر کہا۔
"بخار کی حالت میں کس طرح سفر کرو گے۔ انل تو وہاں آ ہی گیا ہوگا

جیسا کہ تم کہہ رہے تھے یا پھر آنے والا ہوگا۔"
"کیا کہا جا سکتا ہے اِس کے لئے۔ اور میرا اُس کے سامنے وہاں رہنا بھی تو ضروری ہے اگر وہ آ گیا تو ..." اویناش نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔
"وہ تو ہے لیکن پھر بھی۔ ایسے میں تمہارا ٹرین سے جانا بھی تو ٹھیک نہیں، ایسا ہے کہ اگر کل بخار نہ ہوا تو میں خود پہونچا دوں گا تمہیں اپنی گاڑی سے۔ اطمنان رکھو۔" بہت جھجکتے ہوئے ڈاکٹر نے کہا اور بات اُس کے اوپر ہی رکھ دی حالانکہ وہ خود موہنی کی طرف سے پریشان تھا اور وہاں جانے کا خواہش مند بھی۔

وہ پورا دن اویناش نے سخت اضطراب کے عالم میں بستر پر گذارا اور اگلے صبح ناشتہ کرتے ہوئے اُس نے پھر چلنے کی ضد شروع کر دی۔
"ٹھہرو۔ مجھے ٹمپریچر لینے دو۔ اگر واقعی بخار نہ ہوا تو شام کو چلیں گے۔"
"بخار مجھے اب نہیں ہے بھائی صاحب۔ آپ وہم کر رہے ہیں بیکار کا۔"
لیکن یہ وہم نہیں تھا بخار اُس کو اب بھی سو ڈگری کے قریب تھا کافی دیر بحث کرنے کے بعد مجبور ہو کر وہ پھر لیٹ گیا اور بارہ بجتے بجتے بخار اُس کا بڑھنا شروع ہو گیا اور کوئی ڈیڑھ بجے کے قریب جب ڈاکٹر اُس کے پاس آیا تو اُس کو تیز بخار تھا اور وہ بے خبر پڑا ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے اُسے ہوشیار کر کے ٹمپریچر لیا تو بخار ۱۰۲.۴ نکلا۔
"دیکھئے آپ نے مجھے صبح روک لیا بھائی صاحب۔ میں اچھا خاصا نکل جاتا۔" اُس نے شکایت کی۔
"راستے میں بخار تیز ہو جاتا اور گاڑی میں ہی بے خبر ہو جاتے تو؟"
"سنو گھبراؤ نہیں۔ میں دو دن کی چھٹی لئے لیتا ہوں۔ کل ضرور چلیں گے اور کل تم کو بخار بھی نہیں ہوگا۔ میں دوا بدل کر دے رہا ہوں۔" ڈاکٹر نے

دوا کھلا کر اُس کو لِٹا دیا اور رضائی اچھی طرح اُڑھا کر کھانا کھانے چلا گیا۔

اور جیسا کہ ڈاکٹر نے کہا تھا رات اُس کا بُخار بالکل اُتر گیا اور صبح اُٹھکر جب وہ باہر آیا تو اُس کو پہلی جیسی گرانی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر نے ٹمپریچر لیا اور اُس کو اطمنان دِلاتے ہوئے تیار ہونے کی تاکید کرتا ہوا گاڑی لے کر ہاسپٹل کے لئے روانہ ہو گیا۔ کوئی گیارہ بجے کے قریب وہ آیا اور ایک جوڑا کپڑوں کا اور کچھ ضروری سامان اٹیچی میں رکھ کر شامو اور چوکیدار کو کچھ ہدائتیں دیتا ہوا اوِیناش کو ساتھ لے کر گاڑی میں آبیٹھا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ ایک گھنٹہ میں وہ سہارنپور پہونچ گئے۔

ڈاکٹر نے جیسے ہی موہنی کے گھر کی طرف جانے والے راستے پر گاڑی کو موڑا، سامنے ہی اپنے کلینک میں بیٹھے ہوئے ڈاکٹر سعید نے اُسے دیکھ لیا اور تیزی سے کُود کر سڑک پر آ گیا۔

"آؤ بھئی خوب آئے۔" گاڑی رُکتے ہی اُس نے کھڑکی کے اندر ہاتھ ڈال کر سریندر سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا اور دروازہ جلدی میں خود ہی کھول کر اُس کا ہاتھ پکڑ کر گاڑی سے اُتار کر اپنے ساتھ لئے ہوئے چبوترے کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

اوِیناش بھی نیچے اُترا اور اٹیچی ہاتھ میں پکڑے ہوئے وہیں سے چیخ کر بولا۔

"میں جا رہا ہوں بھائی صاحب۔"

"اچھا جاؤ۔ میں آجاؤں گا تھوڑی دیر میں۔" اور وہ دونوں اندر داخل ہو گئے۔

اوِیناش موہنی کے یہاں آکر دروازے میں داخل ہوا تو گھر بھرا بھرا سا نظر آیا۔ اُس نے اٹیچی وہیں دروازے کے پاس رکھ کر حیرت سے اِدھر اُدھر نظر ڈالی۔ پنکی جو صحن میں ایک طرف گیند ہاتھ میں لئے کھڑی تھی، خوشی

سے چہکتی ہوئی دوڑی اور اُس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔ اُس نے جھک کر اُسے گود میں اُٹھایا اور پیار کرتے ہوئے بولا۔

"تم ٹھیک تو ہو؟ اور نانی کہاں ہیں؟"

"وہ اُدھر ہیں آنٹی کے پاس۔ اور ماما پپّا کو لے کر نہیں آئے۔"

"آئے ہیں وہ بھی آئے ہیں بیٹے۔"

کہاں ہیں وہ اشتیاق بھرے انداز میں دروازہ کو دیکھنے لگی۔

"وہ اپنے دوست کے پاس رُک گئے ہیں ابھی آجائیں گے۔" اویناش نے اُس کو گود سے اُتارتے ہوئے کہا اور پھر فوراً ہی لکشمی اُس کو نظر آئی جو پانی کا گلاس ہاتھ میں لئے موہنی کے کمرہ سے نکل رہی تھی۔ اُس نے بھی اویناش کو دیکھا اور پانی کا گلاس میز پر رکھ کر تیزی سے "آگئے بھیّا" کہتی ہوئی اُسکے پاس آگئی اور دونوں ہاتھ اُس کے کندھوں پر رکھ کر سِسک پڑی۔

"تم نے اتنے دن لگا دیئے بھیّا۔ دیدی کتنی بار تمہیں پوچھ چکی ہیں انکو نہ جانے کیا ہو رہا ہے۔ میرے کارن میری دیدی کی جان نہ چلی جائے کہیں۔ میں پیدا ہوتے ہی مر کیوں نہ گئی بھیّا۔"

"چُپ۔ چپ ایسے نہیں کہتے لکشو!" اُس نے اُس کا سر تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "اب کچھ نہ ہوگا۔ دیدی بھی ٹھیک ہو جائے گی۔ میں ایک اچھی خبر لے کر آیا ہوں۔"

"کیسی خبر بھیّا؟" اُس نے، اُس سے الگ ہوتے ہوئے پوچھا۔

"تیرے دولہا کی۔ میں اُس سے مل کر آیا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے وہ برآمدے کی طرف لپک گیا اور لکشمی شرما کر وہیں کھڑی رہ گئی۔

"ماں کہاں ہیں؟" برآمدے میں جا کر وہ پھر پلٹا۔

"اُدھر والے کمرہ میں ہیں وہ۔" وہیں کھڑے کھڑے مُڑ کر لکشمی نے کہا اور انگلی سے کمرہ کی طرف اشارہ کر دیا۔

"ماں!" اُس نے اندر جاکر آہستہ سے پکارا۔ اور ماں جو آنکھیں بند کئے لیٹی تھی چونک کر اُٹھ بیٹھی۔

"آ گئے تم؟"

"ہاں ماں! مجھے کئی دن ہو گئے وہاں سے آئے ہوئے تو۔ میں پہلے رڑکی چلا گیا تھا اور سوچ رہا تھا کہ فوراً ہی یہاں آجاؤں گا لیکن وہاں جاکر مجھے بخار نے آگھیرا اور تین چار دن خراب ہو گئے بیکار میں۔ آج طبیعت ٹھیک ہوئی ذرا تو بھائی صاحب کے ساتھ اُن کی گاڑی سے فوراً ہی چل پڑا۔"

"تو سریندر بھی آئے ہیں؟ کہاں ہیں؟"

"وہ ڈاکٹر رضوی کے کلینک میں ہیں۔ ابھی آجائیں گے۔"

"اور بخار اب تو نہیں ہے تمہیں؟" انہوں نے اُس کے ہاتھ ماتھا چھوتے ہوئے تشویش سے کہا۔

"نہیں اب تو ٹھیک ہوں۔ رات سے بخار نہیں ہوا۔ اور دیدی کا کیا حال ہے، ماں؟ یہ پوچھنا تو میں بھول ہی گیا۔ اُنہیں کی وجہ سے میں سیدھا رڑکی گیا تھا پہلے۔ اور ہاں ایک بات تو بتاؤ۔ وہ انل آیا یا نہیں ابھی تک؟" اُسے فوراً ہی انل کا خیال آیا۔

"کون انل؟ یہاں تو کوئی بھی نہیں آیا۔" ماں نے کچھ حیرت کے ساتھ کہا۔ "یہاں تو کل موہنی کا بیٹی پرکاش، اُس کی ماں اور موسا آئے ہیں۔"

"کیا کہا؟ پرکاش آیا ہے اور اُس کی ماں بھی؟" وہ تعجب میں رہ گیا۔

"ہاں ہاں پرکاش اور اُس کی ماں آئی ہے۔ تم اِس طرح چونک کیوں پڑے؟"

"چونکنے کی بات ہی ہے۔ وہ کیا لینے آئے ہیں اب؟" اُس کی آواز میں غصہ آگیا تھا۔

"ہیں کہاں وہ؟" تھوڑی دیر خاموش رہ کر اُسنے پوچھا۔
"ہوں گے کہیں۔ تم اب بچّوں جیسی باتیں نہ کرو۔ لڑوگے کیا؟ موہنی اُدھر کمرہ میں ہے اُس کو دیکھو۔"
"کیسی ہیں وہ؟ کیا زیادہ بیمار ہوگئیں۔ میں تو پہلے ہی سوچ رہا تھا۔"
"ہاں وہ ٹھیک نہیں ہے۔ کیا کرے غریب۔
"کیسی حالت ہے آخر؟"
"حالت کیا ہوتی۔ بے ہوش ہو جاتی ہے کبھی بھی۔ ڈاکٹر سعید بیچارہ اچھّی سے اچھّی دوا دیتا ہے۔ جتنی دیر بیٹھا رہتا ہے سمجھاتا ہی رہتا ہے اور اُس کا جی بہلانے کی کوشش کرتا ہے۔ کبھی کبھی ٹھیک بھی رہتی ہے لیکن کسی وقت بھی پھر وہی پہلے جیسی حالت ہو جاتی ہے۔ پرسوں اور کل آدھے دن تک اچھی خاصی رہی مطلب یہ کہ کچھ سنبھلی ہوئی نظر آتی تھی کہ کل شام پرکاش اُس کا پتی جیسے ہی اُس کے پاس گیا پھر دورہ پڑ گیا۔ اندر لیٹی ہوئی تھی۔ پہلے تو اُس کو اچنبھے سے دیکھا تھوڑی دیر پھر ہڑبڑا کر کھڑی ہوئی اور چکرا کر ایسی گری کہ ہوش ہی نہ آیا کتنی دیر تک۔ جب سے اور نڈھال ہو رہی ہے۔"
"تو تم لوگوں نے اندر جانے کیوں دیا اُس کمین کو۔ اُس کو دیکھ کر غصّہ پر قابو نہ رہا ہوگا۔"
"غصّہ وصّہ نہیں ہوتا بیٹا۔ تم کیا جانو عورت کے دل کو۔ پتی ہے ابھی تو بہت دنوں میں اُس کو دیکھا۔ کچھ تعجّب۔ کچھ شکوہ۔ خوشی۔ غم۔ بس وہ کمزوری کی وجہ سے سہہ نہ سکی۔ نہ جانے کیا کیا وچار آئے ہوں گے اُس کے من میں اُس وقت۔"
"بس تو اُسکو اُن کے پاس بھیجنا غلط ہوا نا۔ ایسی کمزوری کی حالت میں۔ آخر آئے کس خوشی میں ہیں یہ سب؟"
"اُن کے موسا ان لوگوں کو ساتھ لائے ہیں۔ کچھ سمجھوتے کی بات

چاہتے ہیں۔"

"اب کوئی سمجھوتہ نہیں ہوتا۔ بابوجی کیا کہہ رہے ہیں؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ ویسے لگتا ہے وہ بھی خوش نہیں ہیں اُن کے آنے سے۔"

"اور بابوجی ٹھیک تو ہیں نا؟ کہاں ہیں؟"

"اُدھر بیٹھک میں ہی ہیں اور ٹھیک ویک کیا ہیں بے چارے۔ بہت دُکھی ہو رہے ہیں۔ ایک تو ہیں ہی کیا اوپر سے بیٹیوں کی چنتا۔ آدھے بھی نہیں رہ گئے۔" اُس کی ماں نے افسوس سے کہا۔

"خیر اب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا ماں۔ وہ انل جس سے لکشمی کی منگنی ہوئی تھی نا؟ وہ وہیں رہتا ہے متھو دیدی کے پاس ہی۔"

"تو کیا وہ ملا تمہیں؟"

"ہاں بہت اچھی طرح ملا ماں۔" اور اوینا شش نے وہ ساری بات ماں کو سنا دی اور بعد میں اُس کے ابھی تک نہ آنے پر کچھ پریشان ہو کر بیٹھ گیا۔

"آجائے گا۔ اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے۔ متھلیش کو چھٹی ڈال کر معلوم کر لو۔" ماں نے کچھ مطمئن ہوتے ہوئے کہا اور دونوں اُٹھ کر موہنی کے پاس چلے آئے۔

"دیدی!" پلنگ کی پٹی پر بیٹھ کر اوینا شش نے اُس کو پکارا۔

"ہوں!" موہنی نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں اُس کی طرف بڑی اُداسی سے دیکھا اور اپنے لرزتے ہونٹ تھوڑے سے کھولے اور بند کر لئے پھر کچھ شکایت بھری نظروں سے اُسے تکتی رہ گئی۔

"کیا ہے دیدی؟ یہ تم نے کیا حالت بنا لی؟" اُس نے پٹی پر پڑا ہوا اُس کا ہاتھ اُٹھا کر اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ "ذرا اُٹھ کر بیٹھو تم۔ میں ایک اچھی سی خبر لے کر آیا ہوں لیکن پہلے مٹھائی منگواؤ اِدھر تم مٹھائی میرے منہ میں دو گی

اور اُدھر میں تمہیں وہ بھڑکتی ہوئی خبر سُناؤں گا۔"

"کیوں بہلاتے ہو مجھے۔" بہت مری ہوئی سی آواز میں اُس نے کہا۔

"میرے نصیب میں کوئی اچھی خبر کہاں سے آئی بھیا۔ میں تو ایک سے ایک بُری خبر سُننے کے لئے ہی پیدا ہوئی ہوں۔ تم میری تقدیر کی سیاہی کو نہیں مٹا سکتے ادیناش کتنی بھی کوشش کر لو چاہے۔" اور وہ بے قابو ہو کر بِسک پڑی۔

"نہیں۔ نہیں دیدی۔ ایسا نہ کہو۔" اُس نے اپنے سہارے سے اُسے اُٹھا کر بٹھا دیا اور ارنل کے ملنے کی پوری بات جلدی جلدی اُس کو سُنا کر ہنس پڑا۔

"اب بولو کیا کہتی ہو؟"

"کیا کہوں۔ کچھ ـــــ" اور وہ بے یقینی کے انداز میں خاموش ہو گئی۔

"ارے یقین نہیں آیا کیا؟ لو صاحب۔ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ ماں تم ہی سمجھاؤ ذرا۔

"ادیناش ٹھیک ہی کہہ رہا ہے بیٹی۔ اب تم اپنے کو سنبھالو۔ تم ہی کو سب کرنا ہے۔ تمہارے سوا بہن کا اور کون ہے کرنے والا۔"

"ہاں دیدی! ادیناش بھی چمک کر بولا۔" اُٹھو اب۔ بیٹھ تو جاؤ کم سے کم۔ تم تو پھر لیٹ گئیں۔" اور جب وہ بیٹھ گئی تو اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مُسکرا کر بولا ـــــ

"اب ذرا ہنس بھی دو۔ ہنسو نا دیدی۔ بس ایک بار تمہیں میری قسم۔" اور وہ ہولے سے مُسکرا دی۔

"اچھا تو اب چلیں؟" سریندر نے رضوی کی طرف دیکھا۔

"ابھی نہیں بھئی امّی سے تو مِل لو۔ ابھی گھر میں چلتے ہیں۔ وہ سنیں گی تو پیچھے پڑ جائیں گی میرے۔"

"پھر مل لیں گے۔ اب تو آ ہی گیا ہوں یہاں اور دو تین دن ٹھہرنے کا بھی ارادہ ہے۔"

"بڑا کرم کریں گے آپ دو تین دن ٹھہریں گے تو۔ ایک ہفتہ سے پہلے سرک کر تو دیکھو ذرا۔"

"نہیں بھئی چھٹی بس دو دن کی ہی لی ہے۔ اور پھر سرکاری نوکری ہے کچھ تو خیال کرو۔ تمہاری طرح آزاد تھوڑا ہی ہوں میں۔" اور وہ یہیں تک کہنے پایا تھا کہ ایک لڑکا آیا اور رضوی کی طرف دیکھ کر بولا۔

"صاحب! آپ دونوں کو اندر بُلایا ہے بیگم صاحبہ نے۔"

"دونوں کو؟" رضوی نے حیرت سے کہا۔ "اِن کے آنے کی خبر کیسے ہوئی اُن کو؟"

"جی یہ صاحب جب گاڑی سے اُتر رہے تھے تو کھڑکی میں سے دیکھ پایا تھا بیگم صاحبہ نے۔"

"اچھّا جاؤ۔ کہنا ابھی آتے ہیں۔ لو بھئی اب کیسے بچ کر جاؤ گے" سعید نے کہا اور دونوں ہنستے ہوئے کھڑے ہو گئے۔

آگے رضوی اور پھر سریندر مکان میں داخل ہوئے۔ سامنے برآمدے میں ماجدہ بیگم ایک بڑے سے پلنگ پر اپنی پوری آن بان اور وضعداری کے ساتھ سیاہ رنگ کے چھپے ہوئے ریشمی غرارے۔ سفید کُرتے اور سفید ہی بیل ٹنکے دوپٹہ میں ملبوس، پاندان سامنے لئے ہوئے بیٹھی تھیں۔ سریندر کو دیکھ کر پاندان بند کر کے پلنگ سے پیر اُتارے اور مسکراتے ہوئے کھڑی ہو گئیں۔

"آداب عرض ہے امّی جان۔" سریندر نے اُن کی طرف بڑھتے ہوئے

کہا اور قریب آکر سر جھکا لیا۔

"جیتے رہو بیٹا۔ ہزاری عمر ہو۔" انہوں نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"کہو اچھے تو ہو؟ بڑے دن بعد یاد آئی یہاں کی۔"

"جی بس آنا ہو ہی گیا امّی۔" سریندر نے کہا۔ "کہئے مزاج تو اچھا ہے؟"

"ارے ہم بوڑھے آدمیوں کا کیا ہے بیٹے۔ ٹھیک ہی ہیں۔" ماجدہ بیگم ایک لمبا سانس لیتے ہوئے بولیں۔ "تم لوگوں کو خوش اور آرام سے دیکھ لیں تو خوش ہیں۔ ذرا سی تکلیف میں دیکھیں تو بے چین اور بیقرار۔ اور سناؤ؟ دلہن تو کیسی چلی گئی غریب۔ کچھ بھی نہ دیکھا دنیا میں۔" اُن کی آواز بھرّا گئی تھی۔

"کیا کریں امّی! تقدیر کا لکھا کون ٹال سکتا ہے۔" اور وہ سر جھکا کر خاموش بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد پھر سر اُٹھا کر بولے۔

"اور ہاں آپ بہو کیوں نہیں لے آئیں ابھی تک؟"

"پورے گھر میں اکیلی اکیلی پھرتی ہیں۔ دِل بھی نہیں لگتا ہوگا۔ یہ آپ کا بیٹا بڑا ہی نالائق ہے واقعی۔ اسے آپ کا ذرا خیال نہیں۔"

"ارے نہیں بیٹا۔ یہ کیا کرے غریب۔ وہ ہمارے بھائی صاحب ہی کچھ ایسے جھکّی قسم کے آدمی ہیں کہ اپنے سامنے کسی کی چلنے ہی نہیں دیتے۔ اُن ہی کی وجہ سے اتنی دیر ہوئی اب تو شکر ہے کہ راضی ہو گئے ہیں۔ بس اب تو عید تک ہاتھ پیلے کر ہی دوں گی اِس کے۔"

"بڑی خوشی کی خبر ہے یہ تو۔" سریندر نے شرارت سے رضوی کی طرف دیکھتے ہوئے اُن کی بات پوری کردی۔ وہ بھی مُسکرا کر چُپ ہوگئیں۔ کچھ دیر بعد ایک بوڑھی سی عورت نے آکر چائے لگ جانے کی اطلاع دی تو وہ اُٹھ کر کھڑی ہوگئیں۔

"اچھا اب آؤ چائے پی لو۔ وہ دونوں کو لئے ہوئے کھانے کے کمرہ

کی طرف بڑھیں۔ اُن کا کمرہ بیچ میں پڑتا تھا اُس میں داخل ہوتے ہی سامنے میز پر ایک خوبصورت سی لڑکی کی بڑی سی تصویر دیکھ کر سریندر ٹھٹک کر کھڑے ہو گئے اور امّی کی طرف دیکھ کر اُنگلی سے تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہکلائے۔

"یہ۔یہ شاید۔یہ آسیہ ہی ہے نا؟"

"ہاں بیٹا۔یہ آسیہ ہی کی تصویر ہے۔" اُنہوں نے کہا۔

"اور یہ کمرہ سعید کا ہے؟" پھر چاروں طرف دیکھ کر ___ لیکن یہ کمرہ تو آپکا معلوم ہوتا ہے امّی؟"

"میرا ہی ہے۔" وہ بھی ہنسے بغیر نہ رہ سکیں۔

"آگے بڑھو! کیا سراغ رسانی شروع کر دی۔" رضوی نے اُس کی کمر پر ہاتھ مارا اور ہاتھ پکڑ کر آگے کی طرف گھسیٹ لے گیا۔ چائے شروع ہوئی چائے کے دوران بھی دونوں میں ہلکی ہلکی محبت بھری نوک جھونک چلتی رہی۔

"ارے چندر ابھی سو ہی رہا ہے کیا؟" ماجدہ بیگم کو چندرکانت کی یاد آئی۔

"ارے لڑکے! ذرا اوپر تو جا۔ وہ صاحب جو کل آئے ہیں اگر جاگ گئے ہوں تو اُن سے کہنا کہ آپ کو نیچے بُلا رہی ہیں۔"

"ارے چندرکانت کو تو بھول ہی گئے ہم لوگ اپنی باتوں میں۔ وہ بھی کیا سوچے گا۔" رضوی نے افسوس سے کہا۔

"نہیں وہ سو رہا ہو گا۔ رات اُس کو نیند نہیں آئی تھی اِسی لئے تو میں نے بُلوایا نہیں اُس کو۔" اُس کی ماں بولیں۔

"یہ چندرکانت کون صاحب ہیں؟" سریندر نے میز پر پیالی رکھتے ہوئے پوچھا۔

"یہ بات ذرا لمبی ہے بیٹا۔ تم چائے تو پیو پہلے۔"

"چائے بھی چل رہی ہے آپ شروع تو کیجئے۔"

"جب تمہیں زیادہ ہی شوق ہو رہا ہے تو سُنو۔ چندر کو بس تم میرا بیٹا ہی سمجھ لو اُسے بھی مجھ سے ایسی ہی محبت ہے جیسی ماں سے ہوتی ہے۔ میرٹھ سے یہاں آیا ہے مجھ سے ملنے اصل میں۔ وہاں بجلی کے محکمہ میں کلرک ہو گیا ہے اور خوشی میں یہ خبر سُنانے خود ہی چلا آیا۔ بڑا بھولا اور سیدھا سادا بچہّ ہے۔ ایسا تھا کہ اگست ۱۹۴۷ء کے فسادات کے زمانے میں یہ اپنے باپ کے ساتھ لاہور سے دہلی آیا تھا۔ اس کی ماں اور دو بہنیں تو وہیں مر گئی تھیں جل کر۔ مکان میں آگ لگ جانے کی وجہ سے۔ لیکن یہ باپ بیٹے بچ گئے تھے۔ یہ اسکول گیا ہوا تھا اور اُس کے باپ اپنے دفتر۔" تو جب یہ دہلی آئے تو ہمارے مکان کے سامنے ہی اُن کو ایک چھوٹا سا مکان مل گیا تھا۔ ایک دن میں نے اُس کو باہر کھڑا ہوا دیکھا تو بُلا لیا اور پھر جب اِسنے اپنی کہانی سنائی تو میرا دِل بھر آیا ہو گیا میں نے اُس کو اپنے سینے سے لگا لیا اور جب ہی سے ماں اور بیٹے کا رشتہ قائم ہو گیا۔ اِس کے باپ بھی بے چارے بڑے ہی شریف اور نیک انسان تھے انہوں نے کبھی اِس کو میرے پاس آنے سے نہیں روکا۔ غیور اس قدر تھے کہ کبھی کوئی مدد کرنی چاہی تو اپنے لئے ہر گز قبول نہیں کی۔ بچے پر البتہ کوئی پابندی نہیں لگائی اُس کو تو میں نے بیٹا مان ہی لیا تھا۔ دو ایک مہینے کے بعد پھر نوکری مل ہی گئی تھی اُن کو۔ پچھلے سال انتقال ہو گیا اُن کا بھی۔" وہ یہ باتیں سُنا ہی رہی تھیں کہ باہر سے چندر کانت کے بولنے کی آواز آئی وہ کسی سے اُن کے بارے میں ہی پوچھ رہا تھا کہ کہاں ہیں۔

"ادھر ہوں میں بیٹے آجاؤ اندر چندر کانت!"

اور پردہ ہٹا کر وہ اندر آگیا اور ایک نظر سریندر کے اوپر ڈال کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

"کہو سو لئے کچھ دیر؟" امیّ نے پوچھا۔

"ہاں امیّ خوب سو لیا اور آ ہی رہا تھا نیچے کہ لڑکا بُلانے پہونچ گیا۔"

"اچھا تو چائے پیو۔ لو یہ لو پہلے۔ اُنہوں نے مٹھائی کی پلیٹ اُٹھا

طرف بڑھائی۔"
"آپ لوگ بھی لیں۔" اُس نے پلیٹ اُدھر سرکائی جہاں سریندر اور سعید بیٹھے ہوئے تھے۔
ہم لوگ لے چکے ہیں۔ اب یہ تمہارا حصّہ ہے۔"
"میرا حصّہ اتنا چندر نے آنکھیں پھیلا کر کہا۔ آپ نے مجھے کیا حبشی سمجھا ہے۔"
اُس نے ایک رس گلّا اُٹھا کر منہ میں رکھتے ہوئے سریندر کو دیکھا اور سعید کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔
"آپ بھی بس عجیب ہی ہیں بھیّا۔"
"کیا ہوا بھائی؟"
"ہوتا کیا مجھے ابھی تک یہ نہ معلوم ہو سکا کہ آپ۔ آپ۔ میرا مطلب ہے کہ"
اور اُس نے بہت ہی سیدھے پن کے ساتھ سریندر کی طرف آنکھوں سے اشارہ کر دیا۔
"آپ۔ آپ۔ میرا مطلب ہے۔" یہ کیا؟ سعید نے شرارت سے اُس کی طرف دیکھ کر کہا۔ "بات کرنی آتی ہے تمہیں؟ اور اِن صاحب کے بارے میں کیا بتاتا ہیں تم کو جب کہ مجھے خود نہیں معلوم کہ یہ ذاتِ شریف کون ہیں۔ امّی سے ہی پوچھو۔ یہ جانتی ہیں اِن کو مجھے تو حکم ملا تھا کہ اِن کے ساتھ چائے پیؤں اور میں پینے بیٹھ گیا۔"
"اوں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ دیکھ لیجئے امّی یہ ہمیشہ مجھے بیوقوف بنانے کی سوچتے رہتے ہیں۔" اُس نے امّی کی طرف دیکھ کر اپنی جھینپ مٹانی چاہی۔
"کیا بدتمیزی ہے سعید۔" امّی نے اُس کو ڈانٹا۔ "تم اسے بہت تنگ کرتے ہو۔" اور محبّت سے اُس کی طرف نظر اُٹھا کر بولیں۔
"یہ اِن کے دوست ڈاکٹر سریندر کمار ہیں بیٹیا اور رُڑکی میں سرکاری ڈاکٹر ہیں۔"
"اچھا۔ نمسکار۔" چندر نے ہاتھ جوڑ دیئے اور مصافحہ کے لئے ہاتھ

بڑھاتے ہوئے بولا۔
"بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر ڈاکٹر صاحب۔"
"اور اِن کو رنج ہوا تم سے مل کر۔" سعید نے پھر چھیڑا۔
"نہیں نہیں۔" سریندر نے فوراً ہی نہایت سنجیدگی سے کہا۔
"اور مجھے بھی بہت خوشی ہوئی آپ کو دیکھ کر واقعی اور ساتھ ہی یہ جان کر بھی کہ آپ ہماری امّی کے بیٹے ہیں۔"
اور جب چائے ختم کر کے چندر کانت باہر جانے کے لئے مڑا تو سعید نے پوچھا۔
"کہاں چلے بھئی چندر؟"
"ابھی آتا ہوں ذرا بازار ہو آؤں ایک چیز لینی ہے۔ پندرہ منٹ لگیں گے مشکل سے۔"
"اچھا۔ اچھا۔ پندرہ کی بجائے بیس منٹ لگا آنا۔ امّی تمہیں ماریں گی نہیں اطمینان رکھو۔" سعید نے مسکرا کر کہا۔ لیکن اُسنے کوئی جواب نہیں دیا اور باہر نکل گیا۔
"بُری بات ہے سعید۔" اُن کی ماں نے سمجھایا۔ "وہ سیدھا لڑکا ہے تم اُسے ہر بات میں چھیڑتے ہو۔ مجھے بُرا لگتا ہے۔"
"کیا کروں امّی! وہ بات ہی ایسی بدھو پن کی کر جاتا ہے کہ ہنسی آجاتی ہے۔"
"اچھا اب تو اُٹھو۔" سریندر نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔
"چلتے ہیں ذرا ایک ضروری بات تو سُن لو پہلے۔ ہاں امی کہتی ہیں یا میں شروع کروں؟"
"کونسی بات؟" اُنھوں نے پلکیں اُٹھائیں۔
"ارے لکشمی کے لئے چندر کی بات۔ اچھا تو میں ہی بتاتا ہوں۔ ہاں بھئی سریندر! تم نے چندر کانت کو تو دیکھ لیا نا؟ امّی کا اور میرا

خیال ہے کہ لکشمی کی شادی یعنی چٹ منگنی پٹ بیاہ چندر کے ساتھ ہو جائے۔"
"ہاں بیٹا! اُس کی ماں نے بھی زبان کھولی۔" بہت شریف لڑکا ہے ماں باپ تو ہیں نہیں بیچارے کے نہ کوئی اور رہا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ جلدی سے اُس کا گھر بس جائے۔ جو لا بھی اچھا رہے گا۔ جیسی نیک بھولی بھالی لڑکی ہے ویسا ہی لڑکا بھی ہے اور لین دین کا بھی کوئی جھگڑا نہیں ہے اس کے ساتھ۔"
اور ذرا دیر توقف کر کے وہ پھر بولیں۔
"میں نے صبح اُس سے ذکر بھی کیا تھا اور سب حالات بتا دیئے تھے۔ کہنے لگا مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ جیسا آپ چاہتی ہیں شوق سے کریں لڑکی کے حالات سُنکر تو بہت ہی اثر ہوا اُس کے اوپر۔ بولا پھر تو آپ فوراً بات شروع کر دیں۔ اُن لوگوں کا غم جلد ہی دور ہو جائے تو اچھا ہے۔ کسی کے دِل میں خوشی کے پھول کِھلانا تو بہت ہی بڑائی کا کام ہے بھگوان بھی کتنا خوش ہو گا۔ میں نے بتایا نا بڑا ہی سمجھدار ہے۔"
"وہ تو ہے امی لیکن وہ لڑکا اَنِل جس سے اُس کی منگنی ہوئی تھی وہ بھی تو اب شادی کے لئے رضامند ہے" اور اس سلسلہ کی پوری بات سریندر نے اُن لوگوں کو سُنا دی۔
"ارے نہیں بیٹا" سعید کی ماں بڑے ٹھہرے ہوئے انداز میں بولیں۔
"ہم نے بھی دنیا دیکھی ہے۔ صبح تک وہ لڑکا آیا نہیں تھا۔ سعید گئے تھے اُن کے یہاں اور نہ وہ آئے گا۔ دیکھ لینا۔ یہ مانا کہ لڑکا ایسا نہیں ہے لیکن اِس طرح کے لوگ جیسا اُس کا باپ ہے اپنی ہار کسی حالت میں ماننے کے عادی نہیں ہوتے۔ بہت ممکن ہے اُس نے اِنکار کا خط لکھنے سے پہلے یا بعد میں کوئی لڑکی دیکھ بھی لی ہو۔ وہ بیٹے کی بات کو محض بہلادا سمجھتے ہوئے فوراً رد کر دے گا۔
"ہاں بھئی یقین تو مجھے بھی نہیں کہ وہ آئے گا" سعید بھی بولا۔ اگر اُس کو آنا ہوتا تو آ لیتا اب تک بہر حال دیکھ لیں دو ایک دن اور بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں

کہ وہ اب آئے بھی تو منع کر دینا چاہیئے اُس کو۔ اپنے چندر کانت سے بہتر وہ ثابت ہو ہی نہیں سکتا۔ اور بات یہ ہے کہ اصلی خوشی لڑکی کو جب ہی ملتی ہے جب سسرال میں سب اُس کو چاہت کے ساتھ قبول کریں۔ یہ غلط ہے کہ واسطہ صرف لڑکے سے پڑتا ہے ہمارے سماج میں واسطہ سب ہی سے پڑتا ہے لڑکی کا۔"

"اچھا اب تو اُٹھ جاؤ۔ باقی بات پھر ہو جائے گی۔" سریندر نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔ "ویسے میں بھی اب یہ سوچ رہا ہوں کہ امّی کا اور تمہارا خیال ٹھیک ہی ہے۔ وہاں وہ ان حالات میں خوش نہیں رہ سکے گی۔" اور وہ دونوں جانے کے لئے کھڑے ہو گئے لیکن وہ دروازے پر پہونچے ہی تھے کہ سعید کی والدہ پیچھے پیچھے آئیں اور اُنہیں رُوک کر بولیں۔

"سریندر بیٹا! کھانا یہیں آکر کھانا اور یہیں سو بھی جانا آکر سعید کے پاس میں بستر لگا دوں گی۔ وہاں خود ہی مہمان آئے ہوئے ہیں۔ چھوٹا گھر ہے۔ تمہیں بھی پریشانی ہوگی اور اُن کو بھی۔ میں نے تمہاری ساس صاحبہ سے بھی کہا تھا لیکن موہنی کی وجہ سے اُنہوں نے یہاں سونا مناسب نہ سمجھا۔"

"اور کون مہمان آئے ہوئے ہیں؟" سریندر نے ذرا تعجّب سے پوچھا۔

"وہ موہنی کا شوہر اور ساس وغیرہ ہیں۔" دروازے سے نکلتے ہوئے سعید نے آہستہ سے کہا۔

"موہنی کا شوہر اور ساس وغیرہ؟" سریندر نے حیرت سے سعید کی طرف دیکھا اور کچھ شکنیں اُس کے ماتھے پر اُبھر آئیں۔

"وہ لوگ آخر کس وجہ سے آئے ہیں اب؟"

"وہ لوگ اُس کو لے جانے کے لئے آئے ہیں۔" سعید نے طنز سے کہا۔

"لے جانے کے لئے؟ بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ تو کیا یہ لوگ چاہتے ہیں وہاں بھیجنا اُس کو؟ اور وہ طلاق کی بات؟ میرا مطلب ہے کہ...." اُس نے

کچھ اُلجھتے ہوئے سر اُٹھا کر سعید کو دیکھا۔ اور اُس کی آنکھوں میں بے چینی کی جھلک دیکھ کر سعید ہلکے سے مُسکرا دیا اور بولا۔

"سوال ہی نہیں اُٹھتا وہاں بھیجنے کا تو، میرے دوست۔ منشی صاحب ایسے ویسے آدمی نہیں ہیں۔ وہ بالکل سنجیدہ ہیں اِس معاملہ میں۔ اُدھر میں نے حضور کا معاملہ بھی پہونچا دیا ہے اُن تک۔" اُس نے اُس کے کان میں جُھک کر آہستہ سے کہا اور مُسکرا دیا۔

"میرا معاملہ؟ اور پھر کچھ سمجھتے ہوئے ___ ارے نہیں بھائی میرے نصیب میں یہ سب کہاں ہے؟"

"اب بنو نہیں اُستاد۔ تم جیسوں کو تو بس ہم ہی جانتے ہیں۔" سعید نے کہا اور سامنے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"لو آ گیا مکان اُن کا۔ وہ بیٹھک ہے بائیں طرف جس کے دروازے چبوترے پر کھلے ہوئے ہیں۔ اور وہ جو سامنے ایک آدمی آرام کرسی پر پیچھے ٹیک لگائے بیٹھا ہے وہی پرکاش ہے موہنی کا شوہر۔ بہت مایوس ہے بے چارا۔ آدھا پاگل تو پہلے ہی تھا۔ صبح میں نے اور ڈرا دیا اُس کو۔"

"کیا ڈرا دیا؟" سریندر نے پوچھا۔

"صبح میں موہنی کو دیکھ کر باہر نِکلا تو میرے پیچھے پیچھے آیا اور موہنی کی حالت پوچھنے لگا۔"

"پھر؟"

"پھر کیا۔ میں نے چہرے پر گہری مایوسی لا کر سر اِس طرح ہلایا کہ بوکھلا گیا اور سر دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر وہیں سیڑھیوں پر ہی بیٹھ گیا۔ کسی طرح پیچھا بھی چھوٹے۔ اور اِس کی ماں تو اتنی خطرناک ہے کہ کیا کہوں۔ کسی ناگن کی طرح پھنکار مارتی ہے۔ صبح دروازے میں آ کر مجھ سے کہنے لگی۔"

"بیماری کیا ہے اِس کو آخر؟" "میں نے کہا بیماری کیا ہوتی۔ غم کی بیماری ہے۔" بولی۔ "ٹھیک بھی ہو جائے گی؟" میں نے کہا۔ "کچھ نہیں کہا جا سکتا اِس کے لئے۔" مجھے بُرا تو لگا اس طرح کہتے ہوئے لیکن کیا کیا جائے یہ جھگڑا تو ختم ہو کسی طرح دفع تو ہوں یہ لوگ یہاں سے اسی بہانے۔ یہ بڈھیا جب سے آئی ہے یوں ہی اندر ہی اندر اور بکھری جا رہی ہے۔ مجھے تو یہی لگا کہ اِن لوگوں کے آنے کے بعد سے وہ بہت مضطرب سی نظر آتی ہے۔" اور یہ کہتے ہوئے سعید نے چبوترے کی سیڑھی پر قدم رکھ دیا اور دونوں ساتھ ہی اندر بیٹھک میں داخل ہو گئے منشی دینا ناتھ جی پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے اور تقریباً اُن ہی کے ہم عمر ایک شریف صورت آدمی کرسی پر خاموش بیٹھے تھے۔ پرکاش بے خبری کے عالم میں کرسی پر دراز تھا۔ نہ وہ سو رہا تھا۔ نہ جاگ ہی رہا تھا بس کبھی کبھی آنکھیں کھول کر چھت کو دیکھ لیتا تھا اور پھر اسی عالم میں پہونچ جاتا تھا۔

"آداب عرض ہے منشی صاحب۔"

"آداب عرض ڈاکٹر صاحب! آئیے اِدھر تشریف رکھئے۔" اُنہوں نے صوفے کی طرف اِشارہ کیا اور اُٹھ کر بیٹھ گئے۔

"آپ آرام کیجئے بیٹھنے کی ضرورت نہیں۔" سعید نے اُن سے کہا۔

"نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔" منشی جی نے کہا اور سریندر کی طرف دیکھ کر بولے۔

"آپ۔ آپ شاید ڈاکٹر ....." اور سر کو پکڑ کر نام یاد کرنے کی کوشش کرنے لگے۔

"ڈاکٹر سریندر۔" سعید نے اُن کو نام یاد دلایا۔

"جی جی۔ اویناش بیٹے نے بتایا تھا کہ آپ بھی اُس کے ساتھ آئے ہیں بڑی مہربانی کی ہے آپ صاحبان نے۔ میں تو صاحب آپ سب کے احسانوں کے نیچے بُری طرح دب گیا ہوں۔" وہ جوش میں آکر کھڑے ہونے لگے۔

"ارے نہیں آپ ایسا نہ سوچیں" دونوں نے ایک ساتھ کھڑے ہوکر اُن کو بستر پر بٹھا دیا۔" اتنی چھوٹی چھوٹی باتیں کہیں احسان کہلاتی ہیں" سریندر نے کہا۔

"یہ تو آپ دونوں کی ذرّہ نوازی اور قدر دانی ہے صاحب ورنہ احسان اور کس کو کہتے ہیں۔ اور ایک وہ دیوی ہے جو آپ کی ننھی سی بچّی کو ساتھ لئے ہوئے مجھ جیسے چھوٹے سے آدمی کے چھوٹے سے گھر میں میری بیمار لڑکی کی وجہ سے تکلیفیں اُٹھا رہی ہے اِس سے زیادہ اور کیا ہوگا" اُنہوں نے سریندر سے مخاطب ہو کر کہا اور یہ کہتے کہتے آواز ان کی رُندھ گئی اور آنکھوں میں آنسو تیر آئے۔

"اُفوہ" سریندر بے چین ہو کر ان کے پاس اُٹھ آئے۔ ان کے آنسو اپنے رومال سے صاف کئے اور ان کو پیچھے کی طرف لِٹاتے ہوئے کہا۔

"آپ بہت کمزور ہیں۔ یہ سب آپ کو نہیں سوچنا چاہئے۔ بالکل نہیں اور یہ کہ ہم سب کے ہوتے ہوئے آپ کو کسی طرح کی چنتا کرنے کی بالکل ضرورت نہیں ہے"

"اور ہاں" کچھ دیر بعد وہ بولے۔"بیٹا کو تو معلوم ہی نہیں کہ آپ آگئے ہیں۔ ابھی ضد کر رہی تھی آپ کے پاس جانے کی۔ بڑی پیاری باتیں کرتی ہے صاحب۔ دِل بہلا دیتی ہے بعض وقت تو۔ ارے بھئی بٹیا!" انہوں نے وہیں سے آواز دی۔" یہ تمہارے پاپا بیٹھے ہیں یہاں"

اوِناش نے اُن کی آواز پر پہلے وہاں آکر جھانکا پھر اندر آگیا۔

"آگئے آپ لوگ؟ بڑی جلدی آئے؟" اس نے طنز سے مسکرا کر کہا۔

"ارے بھئی کیا کرتے اندر والدہ صاحبہ کے حضور میں بھی تو پیش کرنا تھا ان کو ورنہ وہ ناراض ہو جاتیں۔ بس دیر ہو گئی۔ ہاں بچّی کدھر ہے اُسکو تو بلاؤ یا پھر ہم اندر ہی چلیں۔ ماں جی کے پاس وہ بھی انتظار کر رہی ہوں گی"

"آیئے۔" اویناش اُن دونوں کو ساتھ لے کر اندر صحن میں آیا۔ سامنے رسوئی میں لکشمی پیڑھی پر بیٹھی بھگونے میں چمچہ چلا رہی تھی۔ پہلی نظر میں سریندر کو اُس پر موہنی کا گمان ہوا اور وہ ٹھٹک کر وہیں کھڑا رہ گیا اویناش کی نظر بھی اُس پر پڑی اور وہ وہیں سے چیخا۔

"لکشو ادھر تو آؤ۔ کیا ہر وقت رسوئی میں گھسی رہتی ہو۔"

"جی آئی۔" وہ اُٹھی اور سعید کے ساتھ دوسرے مرد کو اچانک ہی دیکھ کر پہلے تو چکرائی پھر کچھ سمجھتے ہوئے شرما کر نیچے نگاہ کئے ہوئے وہیں کھڑی رہ گئی۔

"ارے بھائی صاحب یہی تو ہیں بھئی۔ نمسکار کرو ان کو۔" اور اُس نے وہیں کھڑے مُسکرا کر دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے دھیرے سے نمسکار کہا اور مُنہ دوسری طرف کر کے پوری اُدھر ہی کو مُڑ گئی۔

"نمسکار!" ڈاکٹر نے جواب میں کہا اور اُس کی اِس معصوم اور شرم آمیز حرکت پر ہولے سے مسکرا دیا۔ ایک لمحہ بعد ہی سائڈ کے کمرہ سے پنکی پپّا۔ پپّا چیختی ہوئی آئی اور ڈاکٹر سے لپٹ گئی۔ اُس نے بھی بڑے پیار اُس کو گود میں اُٹھایا اور پے در پے کئی پیار اُس کے پھول سے گالوں کے لے کر بولا۔

"تم ٹھیک تو رہیں پنکو؟"

"ہاں بالکل ٹھیک ہوں۔ میرا جی پہلے دن نہیں لگا تھا پھر لشو آنٹی سے لگ گیا۔ وہ مجھے بہت پیار کرتی ہیں آنٹی سے بھی زیادہ۔"

"اچھّا! اور نانی کہاں ہیں آپ کی؟" سریندر نے اِدھر اُدھر نظر ڈال کر پوچھا۔

"وہ ابھی نہانے چلی گئیں۔ آج گرمی بہت ہے نا۔ اُن کو کیا پتہ کہ آپ بھی آجائیں گے آپ نے اتنی دیر کیوں لگائی پپّا؟ آپ تو ماما کے ساتھ ہی آ گئے تھے۔"

"ہاں بیٹے دیر ہو گئی۔ یہ تمہارے انکل ہیں نا؟ اِن کی ممّی کے پاس اندر چلے گئے تھے ہم۔ تم نے دیکھا ہے نا اُن کو؟"

"دیکھا ہے۔" اُس نے سر ہِلا کر کہا۔ "وہ برقع والی دادی ہیں نا؟ وہ کہتی تھیں ہم کو دادی کہا کرو۔ وہ کیوں نہیں آئیں پپّا؟"

"آجائیں گی بیٹے ___" وہ اُس کو گود میں لئے لئے وہیں کرسی پر بیٹھ گیا جو لکشمی نے اُس کے لئے لا کر رکھ دی تھی دوسری کرسی اویناش نے لا کر رکھی اور اُس پر سعید بیٹھ گئے۔

"بھئی اویناش تم ہی اُٹھا لاتے دونوں کرسیاں تو کیا بات تھی. خواہ مخواہ تکلیف دی اُن کو" سریندر نے اُس کو چھیڑا۔

"ارے یہ آپ کو کچھ کمزور دِکھتی ہے کیا۔ یہ مجھ سے زیادہ طاقت ور ہے لڑائی کروا کر دیکھ لیجئے یہی جیتے گی۔" وہ رو میں کہہ تو گیا لیکن بعد کو کچھ سوچ کر خود ہی جھینپ گیا۔

"پھر تو تمہارے لئے بڑے ہی شرم کی بات ہے بھئی۔" سعید نے چٹکی لی اور وہ جھینپ مٹانے کے لئے تیزی سے بولا۔

"دیکھئے۔ دیکھئے ابھی مُنہ چڑا کر بھاگی ہے میرا۔ ابھی آپ کے سامنے کیسی موم کی بنی ہوئی نظر آرہی تھی۔"

"اچھا ہو گا بس۔ بیٹھو ایک طرف۔ تم کو تو یہی رہتا ہے ہر وقت۔" غسل خانہ سے اُس کی ماں مسکراتی ہوئی نکلیں اور سریندر کی طرف مُڑتے ہوئے کہا۔

"آگئے بیٹا؟"

"جی ماں جی!" اور دونوں اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

"بیٹھو۔ بیٹھو۔ تم لوگ کھڑے کیوں ہو گئے۔" وہ محبت سے دونوں کو دیکھتے ہوئے بولیں اور مونڈھا کھینچ کر خود بھی وہیں بیٹھ گئیں۔

"آپ اچھی تو ہیں ماں جی؟" سریندر نے پوچھا۔
"ہاں اچھی ہوں بیٹا۔ مجھے کیا ہونا تھا"۔ بس موہنی کی طرف سے بے چینی ہے
"ہاں اب کیسی ہیں وہ؟" سعید نے معلوم کیا۔
"اچھی ہے اب تو کچھ"۔ جب سے اویناش آیا ہے"۔ لیکن اِس سے کیا ہوتا ہے بیٹا رات تو وہ اتنی بے چین تھی کہ......؟"
"ہاں ٹھیک تو ہیں وہ پہلے سے ہاں انہیں بھی وہم زیادہ ہی ہے کچھ"۔
"تمہاری اِن باتوں سے وہ اور پریشان ہوتی ہیں۔ ہوتے ہوتے ہی ٹھیک ہوں گی یا ایکدم ہی دوڑنے بھاگنے لگ جائیں گی"۔
"کہاں ٹھیک ہے بھئی"۔ وہ کچھ تشویش سے بولیں"۔ تمہارے سامنے وہ تمہارا دِل رکھنے کو سنبھالے ہوئے ہے خود کو۔ ویسے جو حالت اُس کی ہے وہ میں ہی تو جانتی ہوں اور جب سے پرکاش کا سامنا ہوا ہے وہ تو کھو سی گئی ہے بالکل جیسے کسی گتھی میں الجھ کر رہ گئی ہو—" نہ چاہتے ہوئے بھی دھیمے سے یہ جملہ اُن کے منہ سے نکل ہی گیا۔
"آئیے ڈاکٹر صاحب! دیکھ لیجئے اُن کو"۔ اویناش نے کہا اور وہ دونوں اس کمرہ کی طرف بڑھ گئے جہاں موہنی لیٹی ہوئی تھی۔
سریندر چاہتے ہوئے بھی اُن دونوں کے ساتھ فوراً ہی اندر جانے کی ہمت نہ پیدا کر سکے اپنے اندر اور بجی سے باتیں کرتے ہوئے وہیں بیٹھے رہ گئے۔ سعید نے موہنی کو اچھی طرح دیکھا اور حیران رہ گئے۔ لکشمی کا مسئلہ حل ہو جانے کی خبر سے بھی کوئی خاطر خواہ فائدہ نظر نہیں آیا تھا۔ وہ تو سمجھ رہے تھے کہ وہ اب کچھ بہتر ہو گئی ہو گی لیکن ایسا نہیں تھا۔ کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد اُنہوں نے سریندر کو آواز دی اور جب وہ دبے قدموں اندر آ کر کھڑے ہو گئے تو اُن کے پاس جا کر مشورہ کرنے لگے۔ موہنی نے لیٹے لیٹے کن انکھیوں سے سریندر کی طرف دیکھا اور پورے بدن میں اُس کے

سنسنی سی شروع ہو گئی۔ ہاتھ پیر ٹھنڈے ہونے لگے اور ایک عجیب سی بے چینی چہرے پر پھیل گئی۔

سعید نے واپس اپنی جگہ آکر اُس کی ایکایک ہی بدلتی ہوئی حالت کو دیکھا لیکن کچھ سمجھ نہیں سکے۔ تھوڑی دیر پریشان نظروں سے اُس کی صورت دیکھتے رہے اور دواؤں میں ردّوبدل کرنی شروع کر دی۔ سریندر نے بھی کئی بار کھوئی کھوئی سی افسوس بھری نظریں اُس پر ڈالیں لیکن جان بوجھ کر وہ اُن سے نظریں چراتی رہی۔ آخر دونوں اُٹھ کر باہر آگئے۔

اویناش چائے بنانے میں لکشمی کی مدد کر رہا تھا۔ ان دونوں کے باہر آکر بیٹھتے ہی وہ بھی وہیں آگیا اور سعید کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ سعید نے کچھ کہنے کے لئے مُنہ کھولا ہی تھا کہ اویناش کی ماں کے اشارے پر اُٹھ کر برآمدے میں ان کے پاس چلا آیا جو بڑی پریشان اور اُلجھی اُلجھی سی کھڑی تھیں۔

"کیا بات ہے ماں جی؟" سعید نے اُن کے قریب آکر پوچھا۔

"کیا بتاؤں بیٹا! کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ موہنی کی حالت مجھے سنبھلتی نہیں نظر آتی۔ اُس کے پتی اور ساس سسر کے آنے سے پہلے تو ایسا نہیں تھا جب سے پتی کو دیکھا ہے وہ تو بدل ہی گئی ہے۔ صبح تم کہہ رہے تھے نا کہ حالت اِن کی ایکدم کیوں خراب ہوئی تو...."

"ہاں صبح تو میں بہت گھبرا گیا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کہیں باہر دہلی وغیرہ لے جایا جائے۔ کیا کیا جائے؟"

"ارے یہی تو ساری بات ہے بیٹا۔ باہر لے جانے کا تو وہ نام بھی نہیں لینے دیتی ہاں تو میں یہ کہہ رہی تھی کہ صبح جو اِس کی حالت خراب ہوئی تو اُس کی وجہ یہ تھی کہ رات یہ روئی بہت۔" بھرائی ہوئی آواز میں وہ بولیں۔

کہہ رہی تھی "ماں جی! میں اِن لوگوں کے ساتھ اب چلی ہی جاؤں تو اچھا ہے۔ آپ لوگ سمجھتے ہیں کہ میں بچ جاؤں گی لیکن ایسا نہیں ہے۔ جب مرنا

ہی ہے تو ان کے چرنوں میں ہی کیوں نہ مروں اور آپ ہی لوگوں نے تو سکھایا ہے کہ عورت کی ڈولی جس گھر میں اُترے اُسی گھر سے اُس کی ارتھی بھی نکلنی چاہیئے" میں کتنی ہی دیر تک اُس کو سمجھاتی رہی لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ ایک بار میری آنکھ کھلی تو وہ بھگوان کرشن کی مورتی کے آگے پڑی رو۔ رو کر کہہ رہی تھی۔ "مجھے راستہ دکھا دو بھگوان مجھے کچھ نہیں سوجھ رہا ہے۔ نہیں تو اپنے پاس ہی بلا لو" نہ جانے کب سے پڑی تھی وہاں۔ میں نے بڑی مشکل سے پلنگ پہ لٹایا لا کر تو کتنی ہی دیر تک بے دم پڑی رہی۔ اب تو کچھ ٹھیک ہے بھی۔ تمہارے انجکشن سے جو صبح تم نے لگایا تھا اور دوا دی تھی اور پھر اوینا شش کے آجانے سے کچھ بول چال بھی رہی ہے لیکن رات تو میں نراس ہی ہو گئی تھی کہ صبح بھی ہو گی یا نہیں" اور وہ رونے لگیں۔

"روئیے نہیں ماں جی! سعید بھی اُداس ہو گیا تھا۔

"اب اس اُلجھن کو تو اوپر والا ہی سلجھائے گا۔ اُس کی بڑی قدرت ہے لیکن اچانک اُس میں یہ تبدیلی آئی کیوں؟ اصل میں اُس کے شوہر کو اُسکے پاس بھیجنا ہی غلط ہوا"

"اُس کو روکا بھی کیسے جاتا بیٹا۔ ابھی علیحدگی تو ہوئی نہیں۔ ابھی تو وہ پتی ہے اُس کا"

"بہر حال سمجھائیے اور اُس کو۔ اِس کے علاوہ اور کیا ہی کیا جا سکتا ہے" سعید بجھے بجھے لہجہ میں بولا۔ ہاں آپ یہ کہئے کہ "ابھی ایسی حالت میں وہاں جا کر کیا کرو گی۔ ٹھیک ہو جاؤ تھوڑی سی تو چلی جانا۔ یہ لوگ پھر آ کر لے جائینگے۔ شائد اسی طرح بہل جائے کچھ اور وہ دوا دو۔ دو گھنٹے بعد دینا نہ بھولئے گا"

اور وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا وہیں آگیا جہاں سریندر وغیرہ بیٹھے ہوئے تھے اور اوینا شش کے کہنے سے دو منٹ بیٹھ کر ایک پیالی چائے اُس نے مشکل ہی سے حلق سے اُتاری اور کھڑا ہو گیا۔

"چلو بھئی سریندر امّی انتظار کر رہی ہوں گی۔"
"چلو۔" سریندر بھی مضمحل کھڑا ہو گیا۔
"میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی پپّا انکل کے گھر۔" پنکی بولی۔
"چلو تم بھی۔" سعید نے اُس کو گود میں اٹھایا اور دونوں دروازے کی طرف مُڑ گئے۔

اگلے دن صبح کوئی نو بجے کے قریب جب سب ناشتہ کر چکے اور اوِیناش بھی ڈاکٹر سعید کی طرف چلا گیا تو لکشمی موہنی کے پاس آئی۔
"چلو دیدی باہر۔ تمہارا مُنہ ہاتھ دھلوا دوں۔"
"چلو۔" موہنی کراہتی ہوئی اُٹھ کر بیٹھ گئی پھر لکشمی اُس کو سہارا دے کر باہر لائی چوکی پر بٹھایا اور لوٹے میں گرم پانی لینے رسوئی میں چلی گئی کیونکہ بارش بھی ہو کر رُکی تھی اور برسات کی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔
"بٹیا ہم برتن سب صاف کر دیئے ہیں۔ پہلے ہم کا سودا کے واسطے پیسہ دیتی جاؤ۔" متیا کہاری بول اُٹھی۔ لکشمی نے لوٹا رکھ کر پیسے وہیں ڈبّے میں سے نکالے اور اُس کو دے کر پانی ڈلوانے موہنی کے پاس آگئی۔ ایک ہاتھ میں کنڈی اُٹھا کر دوسرا ہاتھ پیسے رکھنے کے لئے جیسے ہی جیب میں ڈالا کاغذ کا لفافہ اُس کے ہاتھ کو لگا اور وہ شرمندہ سی مسکراہٹ کے ساتھ وہیں چوکی کے پاس آگئی۔
"بٹیا کل شام ڈاکیہ ہمیں یہ چٹّھی دے گئے تھے۔ کیسی ہماری کھوپڑی ہے۔ ہم آپ کو دینا بھول گئے۔ یہ لیو!" اُس نے لفافہ لکشمی کو پکڑا دیا۔ لکشمی کے ایک ہاتھ میں لوٹا تھا۔ لوٹا چوکی پر رکھ کر اُس نے لفافہ کھولا اور شرما کر پرچہ وہیں چوکی پر ڈال کر آگے بڑھ گئی۔ پرچہ پر اوپرا نبالہ لکھا ہوا اُس نے پڑھ

لیا تھا۔ موہنی چوکی پر کھڑی مُنہ ہاتھ تولیہ سے صاف کر رہی تھی۔ اُس نے تولیہ وہیں تار پر ڈالا اور خط اُٹھا کر پڑھنے لگی۔ اور وہی خط، کاغذ کا وہی پُرزہ اُس کی موت کا پروانہ بن گیا۔ یہ متھلیش کا خط تھا اوینا شی کے نام اور اُس میں بہت دُکھ کے ساتھ اُس نے لکھا تھا کہ انل اب وہاں نہیں آئے گا۔ اُس کو بہت مجبور کر دیا گیا ہے۔ اُس کے باپ نے وہاں انکار کا خط لکھنے سے پہلے ہی ایک پیسے والے آدمی کے یہاں اُس کی بات پکّی کر دی تھی اور اب اپنے سے کہیں بڑے اور عزّت والے آدمی کی اکلوتی لڑکی کے لئے وہ انکار کی ہمّت نہیں کر سکتے کیونکہ اس میں اُن کی عزّت کا سوال ہے اور لڑکی کے باپ کی طرف سے خطرہ بھی۔ کہ ایسی صورت میں وہ نہ جانے کیا کر گذرے اور لکھا تھا کہ انل نے کوئی کسر نہیں چھوڑی بہت ہاتھ پیر مارے۔ جہاں ہو سکا کچھ نہ کچھ کرتا ہی رہا کئی دن تک گھر میں سخت ہنگامہ رہا مگر آخر وہ بے بس ہو گیا جب اُس کی ماں نے کوئی زہریلی دوا پی کر اپنی حالت خراب کر لی۔ اور آخر میں اُس نے یہ بھی لکھا تھا کہ انل ہسپتال سے اُس کے پاس آیا تھا کیونکہ اُس کی ماں وہاں داخل ہے اور ابھی خطرے کی زد میں ہے اور یہ سب لکھنے کو کہہ گیا تھا۔

موہنی نے کانپتے ہاتھوں سے خط پڑھا۔ ایک دو منٹ خود پر جبر کئے چوکی پر کھڑی رہی اور پھر اچانک ہی تیورا کر نیچے آ گری۔ وہ اتنی زور سے اور کچھ ایسے بے تکے پن سے پکّے فرش پر گری کہ آواز گھر میں قریب قریب سب نے ہی سُنی۔ سب سے پہلے رسوئی کے دروازہ میں کھڑی لکشمی نے پلٹ کر دیکھا اور ایک چیخ کے ساتھ بھاگتی ہوئی اُس کے پاس آئی اور وہیں زمین پر بیٹھ کر اُس کا سر اپنی گود میں رکھا اور اُسے آوازیں دینے لگی۔ بہن کی آواز پر اُس نے ایک مرتبہ سخت بے چینی کی حالت میں نظر اُٹھا کر حیرت سے اُسے دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے دو تین ہچکیاں لیں اور آخری ہچکی کے ساتھ سر ایک طرف کو ڈھلک گیا اور...... اور زندگی کا چراغ بجھ گیا۔

لو ختم ہو گئی صرف دھواں تھر تھراتا رہ گیا اور اُسی کے ساتھ کہانی بھی کہیں دور کھو گئی۔ داستان بکھر گئی۔

لکشمی کی چیخ سُن کر اوِیناش کی ماں اور موہنی کی ساس بھی کہیں اندر سے بھاگ کر آ گئی تھیں۔ اُدھر بیٹھک سے منشی جی۔ پرکاش اور اُس کے موسا بھی آ گئے اور سب اُس کے چاروں طرف کھڑے ہو گئے۔ سب اپنی جگہ مبہوت کھڑے ہوئے تھے۔ اِس فوری واقعہ سے کسی کے ہاتھ پیروں میں اتنی سکت نہیں رہی تھی جو آگے بڑھ کر کوئی اُس کے پاس جاتا یا اُس کو دیکھتا۔ پرکاش بھی کچھ دیر تو کھڑا دیکھتا رہا پھر تیزی سے آگے بڑھا اور اُس کے پاس اُکڑوں بیٹھ کر اُس کی ناک کے پاس ہاتھ لگایا پھر اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اُس کی نبض دیکھی اور ایک چیخ مار کر پیچھے سرک گیا جو بعد میں ایک زوردار قہقہے میں تبدیل ہو گئی۔

ماں۔ ماں! بدھائی ہو تمہیں۔ اب تو خوش ہو گئیں تم۔ وہ چلی گئی۔ چلی گئی۔ چلی گئی بہت دور۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔"

اور جب لکشمی نے یہ سُنا تو مُنہ پھیر کر بہن کا لٹھّے کی طرح سفید چہرہ دیکھا اور زور سے چیخ پڑی۔

"نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا اور بڑی بے قراری سے اُسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر پھر آوازیں دینے لگی۔

"دیدی۔ دیدی۔ میری دیدی بولو۔ بولو دیدی۔ اچھّا ایک بار میری طرف دیکھ لو دیدی بس ایک بار۔ اور وہ اُس کے سینے سے چپک کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور جب اُسے چھوڑ کر اپنا سر اُس نے زور سے زمین پر مارنا شروع کیا تو اوِیناش کی ماں نہ جانے کس طرح سرک کر اُس کے پاس آئیں اور اُس کا سر اپنے ہاتھوں میں تھام کر اُسے اپنے سینے سے لگا لیا اور خود بھی تڑپ اُٹھیں۔

"ماں جی دیدی۔ میری دیدی میری بہن کہاں گئی ماں جی" اور یہی گردان

کرتے کرتے وہ اُن کی گود میں ہی بے ہوش ہو کر جھول گئی۔
منشی جی بے چارے۔ انتہائی کمزور آدمی۔ پہلے ہی چلنا پھرنا تک جنہیں دشوار تھا جب کھڑے نہ رہ سکے تو گوپال بابو نے بڑھ کر اُنہیں سنبھالا اور بڑی مشکل سے برآمدے میں پڑی چارپائی پر لا کر لٹا دیا اور اُن کی حالت کو بگڑتے ہوئے دیکھ کر دروازے کی طرف جھپٹے ڈاکٹر سعید کو بلانے کے لئے جن کا کلینک اُنہوں نے آج صبح ہی بازار جاتے ہوئے دیکھا تھا اُن کے جانے کے چند منٹ بعد اویناش تیزی سے دروازے میں داخل ہوا۔ حیران دبدھا کی یقین اور بے یقینی کے درمیان اُلجھا ہوا پڑوس کی عورتوں کو ہٹاتا ہوا جو موہنی کے گرد اگرد جمع ہو گئی تھیں وہ آگے بڑھ گیا اور زمین پر اُسکے پاس بیٹھ کر لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔
"یہ کیا ہو گیا اِن کو۔ ابھی تو میں اچھا بھلا چھوڑ کر گیا تھا؟"
اُس کے پیروں کے پاس پرکاش زمین پر اوندھا پڑا رو رہا تھا۔ اُس کی آواز پر سر اٹھا کر بولا۔
"چلی گئی بھیا۔ چلی گئی بھگوان کے پاس۔ سورگ کی چڑیا سورگ کو اُڑ گئی۔"
"نہیں۔ ایسا مت کہو۔" اویناش پوری آواز سے چیخ پڑا۔
"ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ کبھی نہیں جانے دوں گا کہیں نہیں جانے دوں گا میں اُس۔ آ جا میری بہن! میں تجھے اپنے سینے میں چھپا لوں ارے کس طرح ڈال رکھا ہے زمین پر۔" یہ کہتے ہوئے اُسنے جھک کر اُسے اپنے ہاتھوں میں اٹھایا اور مضبوطی سے اپنے ساتھ چپٹا کر کھڑا ہو گیا۔ ڈاکٹر سعید نے اُسے اِس طرح دیکھا تو جھپٹ کر آئے اور پاس ہی موہنی کو لٹوا کر اُس کے اوپر چادر ڈالنا ہی چاہتے تھے کہ اویناش اُس کے اوپر گرتے ہوئے سسک اُٹھا۔
"تم نے اپنا ہی کہا کیا دیدی۔ میری ایک نہیں مانی۔ میں بھی تم سے

نہیں بولوں گا اب۔ کبھی نہیں۔ اب میں کیا کروں گا دیدی۔" وہ رو رو کر اُس سے باتیں کر رہا تھا کہ ڈاکٹر نے اُس کو وہاں سے اُٹھایا اور پیچھے خاموش کھڑے سریندر کے ہاتھوں میں اُس کو دے کر موہنی کی طرف پلٹ آئے۔

"بھائی صاحب! موہنی بہن بھی ہمیں دھوکہ دے گئی۔" سریندر کو دیکھ کر وہ بے قراری سے اُس کے کاندھے پر سر رکھ کر بچّوں کی طرح بلک پڑا۔ سریندر نے بڑی محبّت سے اُس کو اپنے سینے سے لگا لیا اور اُس کا سر تھپتھپانے لگے۔

سعید نے موہنی کو آلہ لگا کر اور بغیر آلے کے بھی کئی طریقوں سے دیکھا اور واپس آلہ گلے میں ڈالتے ہوئے آہستہ سے بولے۔

"دل کی حرکت بند ہو گئی۔ لیکن یہ ہوا کیسے؟" اُنہوں نے اِدھر اُدھر دیکھا لیکن کسی نے کوئی جواب نہیں دیا وہ کھڑے ہو گئے اور بیگ اٹھا کر منشی صاحب کی طرف آنا چاہتے تھے کہ چوکی پر بے ہوش پڑی ہوئی لکشمی پر اُن کی نظر پڑی جس کے مُنہ پر عورتیں ہاتھ میں پانی لے لے کر چھڑک رہی تھیں وہیں رُک کر اُنہوں نے کسی دوا میں پھایا بھگویا اور اویناش کے ہاتھ میں دے کر لکشمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے برآمدے کی طرف جہاں منشی دینا ناتھ بڑی امید و بیم کی حالت میں بے خبر پڑے ہوئے تھے اور پھر وہ اُن کی دیکھ بھال میں لگ گئے۔ اویناش پھایا لے کر لکشمی کے پاس چلا گیا اور سریندر مضمحل سے وہاں سے ہٹ کر کھڑکی کے پاس چلے آئے اور اُس کا جنگلہ پکڑ کر کھوئی کھوئی نظروں سے مولسری کے درخت کو تکنے لگے۔ امیدوں کی دنیا اُجڑ چکی تھی ارمان سسک سسک کر دم توڑ رہے تھے کچھ بھی تو نہیں بچا تھا سوائے ایک تپتے ہوئے ریتیلے میدان کے جو دور تک جہاں تک نظر جاتی تھی پھیلا ہوا تھا۔ اُن کے نصیب میں زندگی کی خوشیاں شاید تھیں ہی نہیں۔ وہ کتنی ہی دیر تک اسی عالم میں وہاں کھڑے رہے اور اُس وقت چونکے جب لکشمی درد بھری چیخوں کی آواز

ہر طرف گونج گئی۔ وہ ہوش میں آتے ہی اویناش سے لپٹ کر پھر تڑپنے لگی تھی۔ اتنی دیر سے رکے ہوئے آنسو لکشمی کے معصوم سوالوں پر جو وہ اویناش سے کر رہی تھی، اُن کی آنکھوں سے بہہ ہی نکلے اور آگے بڑھ کر وہ بھی اویناش کے ساتھ اُس کو جھوٹی سچّی تسلّیاں دینے لگے۔ سعید کی والدہ بھی سیاہ برقعہ پہنے ہوئے اِن سب کے غم بانٹتی پھر رہی تھیں۔ اویناش کی ماں سرسوتی دیوی نے اُن کو دیکھا تو دونوں ہاتھ اُن کے گلے میں ڈال کر بچّوں کی طرح اُن سے لپٹ گئیں اور ضبط کی ساری حدیں توڑ کر اِس قدر روئیں کہ وہ گھبرا گئیں اور اندر لے جا کر مسہری پر لٹاتے ہوئے صبر کی تلقین کرنے لگیں۔ جب دل کی ساری بھڑاس نکل گئی تو اُن کو لکشمی کا خیال آیا اور باہر آ کر اُس کو سمجھانے کی کوشش کرنے لگیں۔

منشی جی کی حالت سعید کی کوششوں سے کچھ تبدیل ہوتی نظر آ رہی تھی اور وہ پورے ہوش میں تھے اِس لئے اُس نے سب کو رونے کے لئے منع کر دیا اور سب اُن کے گرد جمع ہو کر اُن کو بہلانے کی کوششوں میں مصروف ہو گئے۔ ڈاکٹر سعید کو وہ بہت مانتے تھے اِس لئے اُن کے سمجھانے سے اُن میں کافی فرق نظر آیا تھا۔ اُن کے بات کرنے کا انداز کچھ ایسا دل نشیں اور لہجہ اِس قدر پُر خلوص ہوتا تھا کہ آدمی کو تسکین ملتی تھی۔ اُدھر اویناش یسر یندر۔ اُسکی ماں اور سعید کی امّی، سب نے اپنی محبّت آمیز باتوں اور حد درجہ دلجوئی سے اُن کو غم کے اُس بھنور سے کسی حد تک باہر نکال ہی لیا۔ آخر میں سرسوتی دیوی اُن کے پلنگ کی پٹّی پر بیٹھ کر کہنے لگیں۔

"بھائی صاحب! آپ تو سب سے بڑے ہیں گھر میں۔ اور مرد ہیں آپ کو تو ہمیں سب کو ڈھارس بندھانی چاہیئے تھی۔ عورت سدا سے کمزور ہے اور بچّے۔ بچّے ہی ٹھہرے اویناش اور لکشمی! آپ اگر ایسا حال بنا لیں گے تو اُنکا کیا ہو گا۔ آپ کا تو یہ فرض تھا کہ بچّوں کو بُلا کر پیار کرتے اُن کو سمجھاتے اُلٹا آپ خود کو کمزور بنا رہے ہیں۔ لکشمی کو بُلا کر اپنے سینے سے لگا لیجئے وہ نادان ہے ابھی

اور کوئی تجربہ نہیں ہے اُسے دنیا کا۔"

"آپ ٹھیک کہتی ہیں بہن! اب میں اور پتھر کا بنا لوں گا اپنے آپ کو۔"
نحیف سی آواز میں وہ بولے۔" دو چٹانیں پہلے ہی سینے پر دھرے ہوئے ہوں جن میں ستیش کی چٹان تو بہت ہی بھاری ہے۔ اب یہ بھی رکھ لوں گا میں لوہے اور فولاد کا آدمی نہیں تو اور کون ہوں۔ میرے بھاگ میں یہی سب تو لکھا ہے بھگوان نے۔ اور کیا ہے۔ کچھ بھی نہیں۔"

"نہیں بابوجی! ایسا نہ کہیئے۔ ابھی آپ کا ایک بیٹا اور ہے۔ آپ مجھے بیٹا نہیں سمجھتے کیا؟ آپ کے بھاگیہ میں جو گھٹائیں تھیں وہ برس چکیں اب آسمان صاف ہے۔ میں آپ کے لئے ہر وقت موجود ہوں بابوجی۔ آپ کو زندہ رہنا ہوگا۔ لکشمی کے لئے۔ میرے لئے۔"

اور اُس کی اِن باتوں سے جیسے اُن میں طاقت سی آگئی۔ اُنہوں نے پیار سے اُس کا سر سہلایا اور بولے۔

"ہاں بیٹا ٹھیک ہے میں زندہ رہوں گا ضرور رہوں اپنے بچّوں کے لئے جاؤ لکشو کو بُلا لاؤ۔"

اوِیناش اُٹھا اور لکشمی کے پاس جا کر اُس کو اچھی طرح سمجھا بُجھا کر لے آیا وہ بڑی ہمّت کے ساتھ اُن کے پاس آ کر کھڑی ہوگئی۔

"بابوجی! آپ نے مجھے بُلایا؟"

"ہاں بیٹی!" اُنہوں نے لیٹے لیٹے دونوں ہاتھ اُٹھا دیئے اور وہ آہستہ سے جُھک کر اُن کے سینے سے آلگی۔

"تم بہت رو رہی ہو بیٹی! ضبط کی وجہ سے اُن کے ہاتھ اور پورا بدن کانپ رہا تھا۔

"نہیں تو بابوجی!" وہ بھی بہت ضبط سے بولی۔ جو کچھ بھگوان لکھ دیتے ہیں کسی کے لئے، وہ تو ہو کر ہی رہتا ہے بابوجی!" رونے دھونے سے مرنے والا

لوٹ کر تو نہیں آجاتا۔ اِس لئے زیادہ دُکھی ہو کر اپنے آپ کو ہلاک کرنے سے اُس کی آتما کو اور دُکھ دینا اچھا ہے کیا؟"

سعید۔ سریندر اور وہاں کھڑے سب ہی لوگ اُس کی اِس بہادری پر تعریفی نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

"میری بیٹی کتنی سمجھدار، کتنی ہمت والی ہے ڈاکٹر صاحب! دیکھا آپ نے؟"

"ہاں صاحب۔" سعید نے بھی اُس کی ہمت بڑھائی۔ "وہ اُس دیش کی بیٹی ہے جہاں رضیہ سلطانہ۔ مہارانی لکشمی بائی۔ چاند بی بی اور ایسی ہی نہ جانے کتنی دلیر عورتوں نے جنم لیا۔ آپ نے لکشمی اِس کا نام سوچ کر ہی رکھا ہے منشی صاحب۔" اور وہ سب یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ کسی نے انل کا خط چوکی کے نیچے سے اُٹھایا اور ادیناش کے ہاتھ میں لاکر دے دیا۔ ادیناش نے خط پڑھا اور سریندر کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

"تو یہ بات تھی۔ میں بھی تو چکّر میں تھا کہ اچانک ہی یہ ہوا کیا۔ کاش چندر کانت والی بات ہم پہلے ہی اُن کو بتا دیتے لیکن یہ کیا پتہ تھا کہ...." اور وہ سر کو پکڑ کر بیٹھ گیا۔

"کیا انل کا خط ہے؟" سعید نے سریندر کی طرف جھک کر خط کا کچھ حصّہ پڑھتے ہوئے کہا۔ "ابھی کوئی کہہ تو رہا تھا باہر کہ ایک چِٹھی آئی تھی جس کو پڑھ کر وہ چوکی سے نیچے گر گئیں۔ اور گرتے ہی سے ان کے دل کی حرکت بند ہو گئی۔ ایسا ہو جاتا ہے کبھی کبھی۔ خصوصاً زیادہ کمزوری کی حالت میں۔"

"اُفوہ۔" سریندر بولے۔ "یہ خط کیا اُن کے ہاتھ میں کسی نے دیدیا تھا؟ ایسا تو ہرگز نہیں ہونا چاہئے تھا۔"

یہ سب سُن کر لکشمی اُٹھی اور ادیناش کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور پھر اندر کمرہ میں آکر خط کی پوری بات اُس کو بتائی۔ اُس نے پھر باہر آکر سب کو وہ واقعہ سُنایا۔

"چھ۔چھ۔چھ۔" سعید نے افسوس سے کہا۔ "چوکی پر کھڑی ہوئی تھیں اور چوکی بھی کافی اونچی ہے۔ وہیں کھڑے کھڑے خط کو پڑھا اور وہیں سے نیچے زمین پر آ گریں پھر تو یہ ہونا ہی تھا۔ یہ جاہل نوکر لوگ بھی جان لیوا ثابت ہو جاتے ہیں کبھی کبھی اگر وہ کل ہی یہ خط دیدیتے تو ادیناش کے پاس ہی آتا۔ اُن کو اندر کمرہ میں خبر بھی نہ ہوتی۔ چلو اچھا ہوا پیچھا چھوٹا اُس کمبخت سے ہمیں خود نہیں کرنا تھا وہاں۔" یہ کہتے ہوئے سعید باہر آئے یہ دیکھنے کے لئے کہ پڑوس کے رمیش بابو نے ارتھی کے لئے ابھی انتظام کیا یا نہیں کیونکہ تھوڑی دیر پہلے وہ چپکے سے کچھ نوٹ اُن کے ہاتھ میں دے کر فوراً ہی منشی جی کے پاس آ گئے تھے۔ اُن کو باہر دیکھ کر سرسوتی دیوی ان کے پاس آ گئیں اور بولیں۔

"بیٹا! یہ پڑوسی لوگ انتظام کر رہے ہیں اور پیسے بھی نہیں لے رہے ہیں کسی چیز کے۔ میں نے رمیش بابو کو دینے چاہے تو نہیں لئے۔ کہنے لگے۔ پیسے مل گئے ہیں۔ آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں ماں جی اِس بارے میں۔ ابھی منشی صاحب بھی یہی معلوم کر رہے تھے۔"

"یہ سب تو بعد میں ہوتا رہے گا۔"

"اور ذرا دیکھنا بیٹا اِدھر آ کر کیسی لیٹی ہے جیسے بول پڑے گی ابھی چہرا کیسا پھول سا لگ رہا ہے۔" وہ اُن کا ہاتھ پکڑ کر اپنے آنسو پونچھتی ہوئی کہنے لگیں۔

سعید نے اُن کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور بولے۔ "ہمّت سے کام لیجئے ماں جی! آپ ہی کو سب کچھ کرنا ہے۔ اور کون بڑا ہے یہاں آپ کے سوا۔"

اور وہ چُپ ہو کر کچھ اور مشورہ اُن سے کرنے لگیں اور پھر واپس چلی گئیں موہنی کے پاس جہاں کچھ بوڑھی عورتیں پہلے ہی سے بیٹھی ہوئی تھیں۔

اور تھوڑی دیر بعد جب ارتھی اُٹھنے کا وقت آ گیا تو ڈاکٹر سعید نے منشی دینا ناتھ کو ایک بار پھر گرنے سے بچایا۔ وہ بڑے سکون سے اُن کے پاس آئے اور بولے۔

"آیئے منشی صاحب! تکلیف کیجئے ذرا سی۔"

"کیا؟ یعنی یعنی ۔۔۔" منشی صاحب کے بدن نے ایک جھٹکا سا کھایا۔

"کچھ نہیں" سعید نے ٹھہرے ہوئے انداز میں بولے۔ بیٹی کو وداع کر دیجئے اور بس انہوں نے اویناش کی مدد سے اُن کو اُٹھا کر کھڑا کیا اور پکڑ کر بجاتے ہوئے باہر کی طرف لے چلے۔ تھوڑا سا آگے آ کر بولے۔

"دیکھئے اس کا خیال رکھئے گا لکشمی سامنے ہی کھڑی ہوئی ہے۔ آپ کی ہمت تعریف کے قابل ہے منشی صاحب! اب دوسروں کو بھی دِکھا دیجئے کہ آپ ۔۔۔ کہ آپ کیا ہیں۔"

"ہاں بابو جی! اب دیکھنا ہے آپ کو۔" اویناش بھی بولا اور قریب لے جا کر اُس کا تھوڑا سا مُنہ کھول کر انہیں دِکھایا اور جب اُنہوں نے اپنا ہاتھ اُس کے چہرے کی طرف بڑھانا چاہا تو سعید نے اُن کو وہیں روک دیا اور اُس کا مُنہ چادر سے ڈھک کر اُن کو واپس لانے کے لئے مُڑ گئے۔

"بس ذرا سا پیار کر لوں اپنی بچّی کو ڈاکٹر صاحب! اتنی اجازت تو دے ہی دیجئے" ڈاکٹر کی طرف مُنہ اُٹھا کر اُنہوں نے بے بسی سے کہا۔

"اچھا کر لیجئے" کچھ سوچ کر ڈاکٹر نے اُنہیں چھوڑ دیا۔

اور وہ اُس کے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کُچھ کہنا چاہتے تھے لیکن آواز رُندھ گئی اور وہ بول نہیں سکے۔ ڈاکٹر نے لکشمی کو بہت سمجھا دیا تھا اور وہ بظاہر خاموش کھڑی بہن کا مُنہ دیکھ رہی تھی لیکن جب منشی جی نے اُس کے مُنہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کچھ کہنا چاہا تو وہ اپنی چیخ نہ روک سکی اور روتی ہوئی بھاگ کر کمرہ میں چلی گئی۔ جہاں سے اُس کی گھٹی گھٹی چیخوں کی آواز باہر تک سنائی دے رہی تھی۔ اُس کی چیخ پر منشی صاحب کو پھر دورہ کی سی کیفیت شروع ہو گئی تھی۔ سعید اُن کا لرزتا کانپتا وجود سنبھال کر اندر لے آئے اور ارتھی اُٹھانے کا اشارہ کرتے ہوئے وہیں بیٹھ کر اُن کی تیمار داری اور دلجوئی کرنے لگے۔

موہنی چلی گئی۔ پورے گھر کو اُداسی اور ویرانی کی سوغات دے کر۔ ارد گرد کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جس میں آنسو نہ ہوں۔ ہر کوئی اُس کی نیکیاں گنوا رہا تھا کوئی اُس کی غم سے بھری زندگی کے بارے میں کہہ رہا تھا تو کہیں اُس کی آخری مورت کی پاکیزگی اور معصومیت کے چرچے ہو رہے تھے۔ غرض جتنے مُنہ اتنی ہی باتیں۔ اور شام ڈھلے اویناش۔ سریندر۔ گوپال بابو اور کچھ محلے پڑوس کے لوگ کسی ہارے اور لٹے ہوئے قافلے کی طرح سر جُھکائے واپس آ گئے۔ سریندر اویناش کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھے۔ گھر کے اندر آ کر اُنہوں نے اُس کے کان میں کچھ کہا اور وہ چُپ چاپ منشی جی اور سعید کے پاس چلا آیا۔ سریندر بھی وہیں آ گئے اور پہلے کی طرح منشی صاحب کی دلجوئی شروع ہو گئی۔ جن کو سعید کی انتھک کوششوں نے پھر موت کے مُنہ سے نِکال لیا تھا۔

رات کو دیر تک سب اُن کے پاس بیٹھے باتیں کرتے رہے اور جب ساڑھے دس بج گئے تو سعید کچھ سوچتے ہوئے اُٹھے اور بغیر کسی کو کچھ بتائے دروازے سے باہر نِکل گئے۔ ذرا ہی دیر میں اُن کے ساتھ ایک لڑکا گرم گرم دودھ کے گلاس سامنے مٹھائی والے کی دوکان سے، لے کر آ گیا اور سب کو بہت اِصرار کر کر کے وہ دودھ اُنہوں نے پلوایا جِن میں موہنی کی ساس۔ پرکاش اور گوپال بابو بھی شامِل تھے۔ پرکاش اور منشی صاحب کو دودھ کے ساتھ ایک ایک گولی نیند کی بھی اُنہوں نے کھِلوا دی اور سریندر کو اپنے ساتھ لے کر چلے گئے۔

گھر میں خاموشی نے بسیرا کر لیا تھا جس کو کبھی کبھی پرکاش کے قہقہے چیخیں اور رونے کی آوازیں توڑ دیتی تھیں۔ سعید اُس کو بھی دیکھتے تھے اور کبھی کوئی دوا اور کبھی نیند کی کوئی گولی یا انجکشن لگا کر سُلا دیتے تھے۔ پرکاش کی ماں اور گوپال بابو سخت پریشان تھے اور آخر تیسرے دن سعید کے مشورہ پر وہ اُس کو آگرہ مینٹل ہاسپٹل میں دِکھانے کے خیال سے ساتھ لے کر روانہ ہو گئے۔

چوتھے دن سریندر بھی واپس چلے گئے اور ایک ہفتہ کے بعد اویناش اور
اُس کی ماں نے بھی منشی جی سے جانے کی اجازت مانگی کیونکہ اُن لوگوں کو اویناش
کے ایک کام کے سلسلہ میں جلد ہی چندوسی پہونچنا تھا اور وہ دونوں ماں بیٹے نہ
چاہتے ہوئے بھی اگلے ماہ پھر آنے کا کہہ کر جانے کی تیاری میں لگ گئے۔ منشی صاحب
کی طرف سے اُن کو ڈاکٹر سعید کی یہاں موجودگی سے پورا پورا اطمینان تھا۔ چلتے وقت
تنہائی میں سرسوتی دیوی نے لکشمی اور سریندر کے بارے میں اشارتاً اپنی رائے کا
اظہار کیا اور ان کی رائے بھی مانگی جس پر منشی جی پہلے تو حیرت زدہ رہ گئے پھر اِس
بات کو اُن پر ہی چھوڑتے ہوئے بولے۔

اب آپ ہی اِس کی ماں ہیں بہن۔ آپ کو پورا اختیار ہے جیسا چاہیں کریں
مجھ سے پوچھنے کی ضرورت ہی کیا ہے ــــــ اور اُن کی طرف سے مطمئن ہو کر وہ اور
اویناش، اُن کو اچھی طرح سمجھا کر یعنی دوا وغیرہ پابندی کے ساتھ استعمال کرنے
کی تاکید کرتے ہوئے بھیگی آنکھوں کے ساتھ وہاں سے روانہ ہو گئے۔

کوئی پچیس[۲۵] دن کے بعد اویناش کی ماں کا خط منشی دینا ناتھ جی
کے نام آیا جس میں اُنہوں نے لکھا تھا کہ سریندر نے بڑی خوشی کے ساتھ
لکشمی سے شادی کرنا منظور کر لیا ہے اِس لئے وہ جلد ہی سریندر کو ساتھ لے کر
وہاں آئیں گی اور بہت سادگی کے ساتھ اِس کام کو انجام دیں گی اور یہ
بھی لکھا تھا کہ اِس سلسلہ میں کسی طرح کے جھنجھٹ میں پڑنے کی ضرورت نہیں
ہے کیونکہ سریندر ان باتوں کو پسند نہیں کرتے۔ اِس کے علاوہ اُنہوں نے
ایک اور اچھی خبر بھی اُنکو لکھی تھی۔ وہ یہ کہ اُن کے بیٹے اویناش کو کام مِل گیا
ہے اور وہ دو سال کی مینیجمنٹ ٹریننگ (Management Training)
کے لئے جلد ہی کانپور چلا جائے گا اور اِس ٹریننگ کے دوران اُسکو ساڑھے آٹھ سو

روپیہ ماہوار ملیں گے اِس لئے اُن کو اور جلدی ہے اِس کام کی اور یہ کہ اپنے سب کے آنے کی صحیح اطلاع وہ اگلے خط میں دیں گی۔

آج صبح کی گاڑی سے منشی دینا ناتھ کی چچازاد بہن ساوتری دیوی اپنے شوہر لڑکی اور داماد کے ساتھ منشی صاحب کے یہاں آکر اُتری ہیں۔ اویناش اُس کی ماں اور سریندر کل شام ہی آگئے تھے۔ اور کسی کو اُنہوں نے اطلاع نہیں دی ہے اور نہ وہ کسی فضول رسم و رواج کے چکر میں پڑنا چاہتے ہیں کیونکہ زخم ابھی ہرے ہیں۔ صرف فرض سے ادا کرنا ہے اور نہ اویناش کے پاس ہی وقت ہے بیکار کی رسموں میں کئی دن خراب کرنے کا۔ اِس کے علاوہ سریندر بھی مصروف آدمی ہیں۔ پڑھے لکھے۔ روشن خیال اور اِن معاملوں میں کسی بھی بے ہودگی یا فضول خرچی کے یکسر خلاف۔ لٰہذا کل شام چار بجے کے قریب خاموشی کے ساتھ لکشمی کو دلہن بنا کر مذہبی رسوم کے ساتھ پھیرے ہوں گے اور اُس کے بعد بدائی ہو جائے گی اِس لئے گھر میں ہلکی سی چہل پہل تو ہے اِن لوگوں کے آجانے کی وجہ سے لیکن لگ نہیں رہا ہے کہ شادی کا گھر ہے۔ بس کبھی کبھی اویناش لکشمی کو دیکھ کر اُسے چھیڑ دیتا۔

اِن لوگوں کے آنے کے تیسرے دن یعنی شادی کے دن کا سورج اپنے ساتھ معمولی سے ہنگامے کو۔ لے کر طلوع ہوا ہے۔ گھر میں اچھی خاصی رونق معلوم ہوتی تھی جس کو کبھی کبھی لکشمی کے رونے کی آواز غم میں بدل دیتی تھی۔ ڈاکٹر سعید پہلے کی طرح آج بھی اپنا کام دھندا چھوڑ کر منشی جی کو گھیرے ہوئے تھے اور نئی نئی باتیں اور چٹکلے سُنا کر اُن کے غموں کو پیچھے ڈالنے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ منشی صاحب کی حالت اب سنبھل چلی تھی اور وہ اب ہر وقت لیٹے رہنے کی بجائے بستر چھوڑ کر اِدھر اُدھر بھی بیٹھ جاتے تھے اِس وقت بھی وہ برآمدے

میں مونڈھے پر بیٹھے ہوئے ادیناش اور ساوتری کے داماد کو کچھ ہدائتیں دے رہے تھے کہ سعید اُن کے پاس آئے اور اُن سے اندر جاکر تھوڑی دیر آرام کرنے کے لئے کہا اور پھر کسی کام سے باہر چلے گئے۔ کوئی ایک گھنٹہ بعد اویناش اُن کو لینے اندر آیا پیچھے پیچھے سعید بھی تھے۔

آئیے" بابوجی اب باہر چلیئے۔

"کیوں بیٹا؟" وہ اُٹھ کر بیٹھ گئے۔

"ارے کنیادان نہیں کریں گے آپ منشی صاحب۔ آئیے" باہر سب آپ کے منتظر ہیں۔

"کنیادان؟ اچھا میں ہی کروں گا کنیادان۔ میں باپ ہوں نا بیٹی کا اور ... پھر بیٹی کو بدا بھی کرنا ہوگا۔ وہ چلی جائے گی پھر اپنے گھر۔ ہاں" وہ آہستہ آہستہ نہ جانے کیا کیا بڑبڑانے لگے۔

"افوہ! یہ کیا لے کر بیٹھ گئے آپ سمجھدار آدمی ہوکر۔ کمال ہے آپ سے بھی۔ آئیے" نا! سعید نے آگے بڑھ کر ان کا ہاتھ پکڑنا چاہا۔

"نہیں۔ میں چلتا ہوں۔ آپ تکلیف نہ کریں۔ آپ کی مہربانیوں سے اس قابل ہوگیا ہوں" اور وہ باہر آکر بیٹھ گئے۔

ایک ڈیڑھ گھنٹے میں سب رسمیں پوری ہوگئیں اور پھر آئی بدائی کی گھڑی۔

سجی سجائی دلہن بنی لکشمی کو جب اُن کے پاس لایا گیا اور وہ "بابوجی" کہہ کر اُن سے لپٹ گئی تو اُن کو رونے سے کسی نے نہیں روکا۔ اب تک کی رُکی ہوئی اُن کے دل کی بھڑاس کا نکلنا بھی تو ضروری تھا اور منظر کچھ ایسا دل گُداز تھا کہ سب ہی رو پڑے۔ ڈاکٹر سعید جیسے باوقار آدمی کا رومال بھی آخر جیب سے نکل ہی آیا اور آنکھوں تک پہونچ گیا۔ اور نوا ور ڈاکٹر سریندر تک اپنے آنسوؤں کو پی نہ سکے اور درد قیمتی موتی اُن کی پلکوں سے نکل کر گالوں پر سے

ہوتے ہوئے نیچے آگرے۔ اور اویناش تو بہت ہی ٹوٹ کر رویا جب وہ منشی جی کو چھوڑ کر بھیا کہتی ہوئی اُس کے کندھے سے آلگی اور اسی طرح ملنے ملانے کے بعد اُس کو باہر گاڑی میں لے جا کر بٹھا دیا گیا اور جب ڈاکٹر سعید نے یہ دیکھا تو وہ ذرا تیز قدموں سے ڈاکٹر سریندر کے پاس آئے اُن کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور محبت سے لبریز آنکھوں سے اُن کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولے۔

"مبارک ہو یہ خوشی میرے دوست۔ دھندلی ہی سہی لیکن بہار تو ہے۔

اور جواب میں سریندر نے اُن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر محبت سے دبایا اور اُن آنسوؤں کو پی گئے جو جذبات کی شدت سے اُن کی آنکھوں میں آگئے تھے اور گاڑی کا دروازہ کھول کر اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے پھر سعید گئے لکشمی کے پاس اور اُس کے سر پہ ہاتھ رکھ کر اُس کو نئی زندگی میں ہمیشہ خوش اور کامیاب رہنے کی دُعا دیتے ہوئے پلٹ آئے۔

چلتے وقت اویناش اور اُس کی ماں دونوں منشی صاحب کے پاس آئے وہ اکیلے کھڑے رو رہے تھے۔ اویناش خاموشی سے اُن کے آنسو پونچھنے لگا تو وہ ٹھنڈا سانس لے کر بولے۔

"ہائے لکشمی بھی چھوڑ کر چلی گئی۔ میں اکیلا رہ گیا۔"

"آپ اکیلے کہاں ہیں بابو جی میں جو ہوں آپکے ساتھ۔ میں اکیلا چھوڑ دونگا آپ کو؟ آپ تو میرے پاس رہیں گے بابو جی۔"

اویناش نے دونوں ہاتھ اُن کے گلے میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"ارے بیٹا اب جیوں گا تو کہیں رہوں گا۔"

"بابو جی!" اویناش نے بے چین ہو کر اُن کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"یہ آپ کیسی باتیں کرنے لگے بھائی صاحب!۔" اُسکی ماں بھی بولیں۔

"اویناش آپ کا بیٹا ہے اِس کے پاس ہی رہیں گے آپ اور ابھی اس کی شادی بھی تو آپ کو کرنی ہے۔ اِس کی بہو آپ نہیں لائیں گے تو اور

کون لائے گا پھر پوتی پوتوں کو کھِلائیں گے آپ یہ ایسا لڑکا نہیں ہے بھائی صاحب جو آپ کو بھول جائے گا۔ سنسار کی ساری خوشیاں ایک دن آپ کے چرنوں میں ہوں گی۔ یہ دن بھی یاد نہ رہیں گے۔"

"ہاں۔ اچھّا۔" منشی صاحب جیسے کسی خواب سے جاگے ہوں۔

"آپ ٹھیک ہی کہہ رہی ہیں۔ میں جیوں گا اب۔ میں جینا چاہتا ہوں اپنے بیٹے اور اپنی بیٹی کے لئے۔ میں سارے غم بھول جاؤں گا۔" اور انہوں نے ہاتھ بڑھا کر اویناش کو اپنے سینے سے بھینچ لیا۔

"اچھّا تو اب چلیں بابوجی۔ آپ اپنا خیال رکھئے گا۔ ابھی تو بُواجی آپ کے پاس ہی رہیں گی نا؟"

"ہاں ساوتری تو میرے پاس رہے گی ابھی۔ وہ بولے۔

"بس ایک دو مہینے کی بات ہے۔ میں لے جاؤں گا آکر تیار رہئے گا۔"

"اچھا بیٹا جیسی تیری خوشی۔"

"اور سنئے بابوجی ڈاکٹر صاحب ہمارے ساتھ نہیں جا رہے ہیں آپکی وجہ سے اُن سے اپنا حال کبھی مت چھپائیے گا جو تکلیف ہو اُن کو فوراً بتا دیا کیجئے گا۔"

"نہیں بیٹا۔ میں کچھ نہیں چھپاؤں گا اُن سے جاؤ دیر ہو رہی ہے بھگوان تم سب کی رکشا کریں۔"

اور جب وہ سب چلے گئے تو وہ دیر تک کھڑے اُس جگہ کو دیکھتے رہے جہاں سجی ہوئی موٹر کھڑی تھی جہاں ابھی تھوڑی دیر پہلے ایک ہنگامہ تھا چہل پہل تھی اور پھر آنسو پونچھتے ہوئے نڈھال قدموں سے اندر گھر میں چلے گئے۔

ختم شُد